

کہ حضرت عائشہ نے بتایا کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے جو میرے اور آپ کے درمیان ہوتا تھا۔ آپ مجھ سے زیادہ جلدی کرتے تھے یہاں تک کہ میں کہتی تھی میرے لیے (پانی، چھوڑ دیں۔ انہوں نے بیان کیا کہ وہ اس وقت دونوں حالتِ جنابت میں ہوتے تھے۔)

عن عائشة قالت سُئِلَ رسول الله صلعم عن الرجل يجذب الببل ولا يذکر احتلاماً قال يغتسل وعن الرجل الذي يدرى انه قد احتلم ولا يجذب بللاً قال لا غسل عليه. قالت ام سليم هل على المرأة ترى ذلك غسلاً قال نعم، ان النساء شقائق الرجال و حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو تری دیکھے لیکن احتلام اُسے یاد نہ ہو۔ آپ نے فرمایا: وہ غسل کرے اور ایسے شخص کے بارے میں میں بھی پوچھا گیا، جسے احتلام یاد ہو لیکن وہ تری نہ پاتے آپ نے فرمایا: اس پر غسل نہیں ہے۔ ام سلیم نے کہا: اگر عورت اس طرح (رطوبت، دیکھے، تو اس پر بھی غسل ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، عورتیں مردوں کا آدھا حصہ ہیں۔)

عنها قالت قال رسول الله صلعم اذا جاوز الختان الختان وجب الغسل فعلمته انا ورسول الله صلعم فاغتسلنا (انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شرمگاہوں کے اگلے حصے باہم متجاوز ہو جائیں تو غسل واجب ہے۔ میں نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا اور غسل کیا۔)

عن عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يغتسل من الجنابة ثم يستدفئ قبل ان اغتسل و حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غسل جنابت کر لینے کے بعد سردی دور کرنے کے لیے، مجھ سے گرمی حاصل کرتے تھے، قبل اس کے کہ میں غسل کروں۔)

عن عائشة قالت كنت اغتسل انا و التي صلعم من انا و واحد و كلانا

جنب وکان یا صرنی فَا تَزْرُقِيَا شَرْنِي وَاَنَا حَائِضٌ وَيَخْرُجُ رَأْسُهُ الْإِثْمُ وَهُوَ مَعْتَكِفٌ
فَاغْسِلْهُ وَاَنَا حَائِضٌ۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ
علیہ وسلم اور میں ایک ہی برتن سے نہاتے تھے وراں حالیکہ ہم دونوں جنبی ہوتے تھے۔ اور
آپ مجھے بحالت حیض ازار باندھنے کا حکم دیتے تھے اور مجھ سے بغلیگر ہوتے تھے اور آپ
اعتکاف کی حالت میں اپنا سر مسجد سے، باہر کرتے تھے اور میں حیض کی حالت میں اسے دھوتی تھی۔

عن عائشة كنت اشرب وانا حائض ثم انا وله النبي صلعم فيضع فاه على
موضع في فيشرب واتعرق العرق وانا حائض ثم انا وله النبي صلعم فيضع فاه
على موضع في حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ میں حیض کی حالت میں برتن سے پانی پیتی تھی اور
پھر اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بڑھا دیتی تھی۔ پس آپ وہاں منہ رکھتے تھے جہاں میں نے
منہ رکھا ہوتا تھا اور آپ پیتے تھے۔ اور میں بحالت حیض ہڈی پر سے گوشت کھاتی تھی اور پھر
اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیتی تھی اور آپ اُس جگہ اپنا منہ رکھتے تھے جہاں میں نے
رکھا ہوتا تھا۔

عن عائشة قالت كنت اذا حضرت نزلت عن المثل على الحصير فلم تقرب
رسول الله صلعم ولم ندن منه حتى تطهر حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں
نے فرمایا: جب میں حائضہ ہوتی تو میں بستر چھوڑ کر چٹائی پر لیٹتی تھی پس ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم سے مقاربت نہیں کرتے تھے جب تک کہ پاکیزگی حاصل نہیں کر لیتے تھے۔

عنها قالت قال لي النبي صلعم ناو لي الخمرة من المسجد فقلت اني حائض
فقال ان حيضتك ليست في يدك راہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ
سے فرمایا: مجھے مسجد سے چٹائی اٹھا کر دے دو۔ میں نے عرض کیا کہ میں حیض کی حالت میں ہوں۔

۱۔ اصل فیصلے میں اس حدیث کے نقل کردہ الفاظ اور ترجمے میں بعض غلطیاں تھیں جن سے مطلب خبط

آپ نے فرمایا: حیض کا اثر تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے (یعنی تم ہاتھ بڑھا کر مسجد سے چٹائی لے سکتی ہو)۔

۲۷۔ مذکورہ بالا بیشتر احادیث میں جو مضامین بیان کیے گئے ہیں، ان کی روایت حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ام سلمہ کی طرف منسوب ہے۔ میں یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ یہ دونوں ازواج جو ہر لحاظ سے کامل تھیں انہوں نے اسی عریانی کے ساتھ اپنی ان پرائیویٹ باتوں کو ظاہر کر دیا ہو گا جو ان کے اور محمد رسول اللہ کے درمیان میاں بیوی کی صورت میں ہوتی ہوگی۔

۲۸۔ میں اپنے آپ کو یہ یقین کرنے کے ناقابل پاتا ہوں کہ محمد رسول اللہ نے یہ باتیں کہی ہوگی کہ دوزخ میں اکثریت عورتوں پر مشتمل ہوگی اور جنت کی اکثریت غریب پر مشتمل ہوگی۔

عن اسامة بن زيد قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قمت على باب الجنة فكان عامة من دخلها المساكين واصحاب الجند محبسون غير ان اصحاب النار قد امر بهم الى النار وقمت على باب النار فاذا عامة من دخلها النساء وراسامه بن زيد سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا اور میں نے دیکھا کہ اکثریت جو اس میں داخل ہو رہی تھی وہ مساکین کی تھی اور دولت مند لوگ روک لیے گئے، سوائے اس کے کہ جو لوگ آگ کے لائق تھے انہیں آگ میں ڈالے جانے کا حکم دیا گیا۔ اور میں آگ کے دروازے پر کھڑا ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اُس میں داخل ہونے والی بالعموم عورتیں تھیں۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اطلعت في الجنة فرايت اكثر اهلها الفقراء واطلعت في النار فرايت اكثر اهلها النساء وابن عباس سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے

لہ غیر ان کا ترجمہ فیصلے میں © rasailojaraid.com یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔

جنت میں جہانک کر دیکھا تو اس میں اکثریت فقراء کی ہے اور میں نے دوزخ میں جہانک کر دیکھا تو اس میں اکثریت عورتوں کی ہے،

۲۹۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو دولت کمانے سے بالواسطہ طریق پر منع کر دیا گیا ہے، کیونکہ اگر وہ دولت حاصل کریں گے تو ان کے جنت میں داخلے کے امکانات کم ہو جائیں گے؟ اگر سارے مسلمان غریب ہو جائیں تو ان کا کیا بنے گا؟ کیا ان کا کلی طور پر خاتمہ نہیں ہو جائے گا؟ کیا اس طرح زندگی کے ہر میدان میں ان کی ترقی رک نہیں جائے گی؟ مزید برآں کیا یہ قابل یقین ہے کہ محمد رسول اللہ نے وہ بات فرمائی ہوگی جو حدیث بخاری کے صفحہ ۸۵۲ پر روایت نمبر ۴۷۲۱ میں عبد اللہ بن قیس سے مروی ہے کہ ”مسلمان جنت میں ان عورتوں سے مباشرت کریں گے جو ایک خیمہ کے مختلف گوشوں میں بیٹھی ہوں گی۔“ حدیثوں اور قرآن مجید کی پرانی تفسیروں نے اسلام کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے اور اس کی وسعت بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ کیا ہمیں ان حالات کو برقرار رہنے دینا چاہیے؟

۳۰۔ بحث کی خاطر اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ جو احادیث محدثین نے جمع کی ہیں وہ صحیح ہیں، تب بھی اس امر کی شہادت موجود ہے کہ اگر ان احادیث کا تعلق دین سے نہ ہو، تو رسول اللہ انہیں حرف آخر کا درجہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ مسلم میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے:

عن رافع بن خدیج قال قال قدم النبي صلى الله عليه وسلم المدينة وهم يابون النخل فقال ما تصنعون قالوا كنا نصنعه قال لعلمكم لولم تصنعوا كان خيرا فتركوه فنقصت فذكروا ذلك له فقال انا بشر اذا امرتكم بشئ من امر دينكم فخذوا به واذا امرتكم بشئ من رأيي فامتنوا بشر رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ مدینے کے لوگ کھجوروں میں پیوند لگاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم لوگ یہ کیا کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہم پیلے سے اسیا کرتے آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: شاید تم ایسا نہ کرتے

تو بہتر ہوتا۔ پس لوگوں نے یہ عمل چھوڑ دیا اور پیداوار کم ہوتی انہوں نے آنحضرتؐ سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ فرمایا: میں انسان ہوں، جب میں تمہارے دین کے معاملے میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اس کی پیروی کرو اور جب اپنی راتے سے کچھ کہوں تو میں بس ایک بشر ہی ہوں۔“ اس کے علاوہ ایک سے زائد احادیث میں محمد رسول اللہؐ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ صرف قرآن ہی وہ ایک کتاب ہے جو تمام شے جہاں سے زندگی میں مسلمانوں کی رہنما ہونی چاہیے۔

۳۱۔ یہ بات کہ محدثین خود اپنی جمع کردہ احادیث کی صحت پر مطمئن نہ تھے صرف اسی ایک امر واقعہ سے واضح ہو جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے یہ نہیں کہتے کہ ہماری جمع کردہ احادیث کو صحیح مان لو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں ہمارے معیار صحت پر جانچ کر اپنا اطمینان کر لو۔ اگر انہیں ان احادیث کی صحت کا یقین ہوتا تو یہ جانچنے کا سوال بالکل غیر ضروری تھا۔

۳۲۔ بعض احادیث، ایسی ہیں جو انسان کی توجہ اس دنیا سے ہٹا دیتی ہیں۔ روحانیت ایک اچھی چیز ہے لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اسے یہودہ انتہا تک پہنچا دیں۔ بنیادی طور پر اللہؐ نے ہمیں انسان بنایا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم اسی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔ اگر وہ چاہتا کہ ہم روحانی مخلوق یا فرشتے بن جائیں، تو اس کے لیے اس سے زیادہ آسان بات کوئی اور نہیں تھی کہ وہ ہمیں ایسا ہی بنا دیتا۔ حقیقی اسلامی قانون کے مطابق مسلمانوں کو اپنی توانائیاں اس مقصد کے لیے صرف کرنی چاہئیں کہ وہ زندگی کو مفید تر، حسین تر اور مکمل طور پر پر لطف بنا سکیں۔

۳۳۔ اگر ہم احادیث کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اکثر احادیث مختصر اور بے ربط ہیں جنہیں سیاق و سباق اور موقع و محل سے الگ کر کے بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا اور ان کا صحیح مفہوم و مدعا مشخص کرنا ممکن نہیں ہے جب تک ان کا سیاق و سباق سامنے نہ ہو اور وہ حالات معلوم نہ ہوں جن میں رسول پاکؐ نے کوئی بات کہی ہے یا کوئی کام کیا ہے۔ بہر حال احادیث کی بالکل نیت سے ہر سے بوری چھان بین اور تحقیق کی ضرورت

ہے۔ یہ کہا گیا ہے اور بجا طور پر کہا گیا ہے کہ حدیث قرآن کے احکام کو منسوخ نہیں کر سکتی، مگر کم از کم ایک مسئلے میں تو احادیث نے قرآن پاک میں ترمیم کر دی ہے اور وہ وصیت کا مسئلہ ہے۔ احادیث کے بارے میں پورا غور و تامل کرنے کے بعد میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوں کہ انہیں اپنی موجودہ شکل میں قرآن کے برابر درجہ نہیں دینا چاہیے اور نہ ہی ان کے اطلاق کو عام خیال کرنا چاہیے۔ میں اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ مختلف محدثین کی جمع کردہ احادیث کو اسلامی قانون کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ تسلیم کیا جاتے جب تک ان کی دوبارہ جانچ پڑتال نہ کر لی جائے اور یہ پڑتال بھی تنگ نظری اور تعصب پر مبنی نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان تمام قواعد و شرائط کو بھی از سر نو استعمال کیا جانا چاہیے جنہیں امام بخاری وغیرہ نے بے شمار جھوٹی، موعود اور جعلی حدیثوں میں سے صحیح احادیث کو الگ کرنے کے لیے مقرر کیا تھا، نیران معیارات کو بھی کام میں لانا چاہیے جو نئے حقائق و تجربات نے ہمارے لیے فراہم کیے ہیں۔ میری یہ بھی رائے ہے کہ حقائق موجودہ کی روشنی میں قیاس و استدلال کے نازک اور لطیف طریقوں کو عمل میں لاتے ہوئے جموں اور عوام کے منتخب نمائندوں کو قرآن پاک کی تفسیر کرنی چاہیے۔ ابو حنیفہ اور اس طرح کے دوسرے فقہاء نے جو فیصلے کیے ہیں اور جو بعض کتابوں میں مذکور ہیں انہیں نظائر کی حیثیت میں وہی درجہ استناد دیا جانا چاہیے جو عام عدالتی فیصلوں کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے اندر مندرج قانون جامد نہیں بلکہ متحرک و منظم ہے۔ قرآن مجید کی تعبیر کو اس انسانی طرز عمل سے ہم آہنگ ہونا چاہیے جو حالات حاضرہ سے متاثر اور مختلف عناصر سے متاثر ہوتا ہے۔ ابو حنیفہ کی طرح دنیوی معاملات کی تحقیقات میں عقل کو استعمال میں لانا چاہیے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق برعظیم ہند و پاکستان کے مسلمانوں کا قانون وسیع تغیرات کا محتاج ہے اور اسے ملک کے موجودہ حالات کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے۔

[اس کے بعد پیرا ۳۴ سے لے کر آخری پیرا گراف ۴۷ تک فائنل جج نے اپیل کے اصل تصفیہ طلب مسئلہ، یعنی مسئلہ حضانت پر بحث کی ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر جامعین حدیث کی روایات کو صحیح اور قرآن کی طرح واجب الاتباع تسلیم کر بھی لیا جائے تب بھی ان سے حضانت کے معاملے میں مسلمانوں کے مروج شخصی قانون کی تائید نہیں ہوتی۔ اگرچہ فیصلے کا یہ حصہ بھی بہت غور طلب اور لائق توجہ ہے، تاہم یہ چونکہ اصل موضوع فیصلہ سے تعلق رکھتا ہے اور اسے زیر بحث لانا مقصود نہیں ہے، اس لیے اس کا ترجمہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس حصے کو اصل انگریزی فیصلے میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے]۔

تبصرہ

کچھ مدت سے ہمارے بعض حاکمان عدالت کی تقریروں اور تحریروں میں سنت کی صحت پر شکوک کے اظہار اور اس کو اسلامی قانون کی بنیاد تسلیم کرنے سے انکار کا رجحان بڑھ چلا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ بعض عدالتی فیصلوں تک میں یہ خیالات نمایاں ہونے لگے تھے۔ مثال کے طور پر اب سے تین چار سال قبل مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے ایک فیصلے میں لکھا گیا تھا:

”اصل مشکل سے سابقہ حدیث کے معاملہ میں پیش آتا ہے جو سنت یا عمل رسول

کی خبر دیتی ہے۔ اول تو یہ امر واقعہ ہے کہ کسی خاص مسئلے سے متعلق ایک حدیث کی صحت

مختلف فیہ ہونے سے کم ہی محفوظ ہوتی ہے پھر زیریں چند معاملات میں تو ثنی کی ثابت

شدہ سنت سے بھی بعض خلفائے راشدین اور خصوصاً عمر نے انحراف کیا ہے اس

کی معتد بہ مثالیں اردو کے ایک عمدہ رسالے میں جمع کی گئی ہیں جس کو ادارہ طلوع اسلام

کراچی نے ”اسلام میں قانون سازی کے اصول“ کے نام سے شائع کیا ہے اور میں نے

اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔۔۔ یہاں میرے لیے یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ سنت

کے مبنی بر وحی ہونے کی دلیل کچھ مضبوط نہیں ہے۔“ (پی۔ ایل۔ ڈی، نومبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱۲-۱۳)

یہ رجحان بڑھتے بڑھتے اب جسٹس محمد شفیع صاحب کے زیر تبصرہ فیصلے میں ایک قطعی واضح

اور انتہائی صورت تک پہنچ گیا ہے اور منکرین حدیث کا گروہ اس کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔

اس لیے ہم ناگزیر سمجھتے ہیں کہ تفصیل کے ساتھ اس فیصلے کا علمی جائزہ لیا جائے اور ملک کے

حکام عدالت اور قانون دان اصحاب کو اس طرز فکر کی کمزوریوں سے آگاہ کر دیا جائے جس

مقدمے میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے، اس کے واقعات سے ہمیں قطعاً کوئی بحث نہیں ہے۔ اور

اس میں جو حکم فاضل جج نے صادر کیا ہے اس کا اسٹیلو جرایڈ کے گفتگو نہیں کرنا چاہئے۔ ہماری

بحث صرف ان اصولی مسائل تک محدود ہے جو اس فیصلے میں قرآن اور سنت اور فقہ کی پوزیشن کے متعلق چھیڑے گئے ہیں۔

دو اصولی سوالات | اس سلسلے میں قبل اس کے کہ ہم اصل فیصلے پر تبصرہ شروع کریں دو اصولی سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں:

پہلا سوال عدالت کے اختیارات سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلامی قانون سے متعلق چوڑی صدیوں سے یہ بات تمام دنیا کے مسلمانوں میں مستحکم چلی آرہی ہے کہ قرآن کے بعد اس کا دوسرا ماخذ سنت رسول ہے۔ ان طویل صدیوں کے دوران میں اس قانون پر جس قابل ذکر مصنف

مسلما نے اپنی حقیقت کو تسلیم کیا ہے مسلمانوں کے اندر کسی ایسے مذہب فکر (SCHOOL OF THOUGHT) یا کسی ایسے فقیہ (JURIST) کا حوالہ نہیں دیا جاسکتا جس کی پیروی مسلمانوں کی کسی قابل

محاط تعداد نے اختیار کی ہو اور وہ سنت کے ماخذ قانون ہونے کا انکار کرتا ہو۔ متحدہ ہندوستان میں جوائنگلو محمدن لارنچ رہا ہے اس کے اصولوں میں بھی ہمیشہ یہ پیڑ مستحکم رہی ہے۔ اور ہمارے

علم میں آج تک کسی مجلس قانون ساز کا بھی کوئی ایسا فیصلہ نہیں آیا ہے جس کی رو سے اسلامی قانون کے اصولوں میں یہ بنیادی رد و بدل کیا گیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ اس صورت حال میں کیا

کوئی منفرد جج، یا کوئی ہائی کورٹ، بلکہ خود سپریم کورٹ بھی قانون میں یہ اصولی تبدیلی کر دینے کا مجاز ہے؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے عدالت کوئی مستقل بالذات قانون ساز ادارہ نہیں ہے۔

جن اصولوں پر ہمارے ملک کا نظام عدل و آئین مبنی ہے۔ ان کی رو سے عدالتیں اس قانون پر کام کرنے کی پابند ہیں جو ان کو قانون ساز ادارے کی طرف سے دیا جائے۔ وہ

قانون کی تعبیر ضرور کر سکتی ہیں اور اس نظام میں ان کی تعبیر کو بلاشبہ قانونی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ہمارے علم میں آج تک یہ بات نہیں آئی ہے کہ انہیں بجائے خود قانون یا اس کے مستند اصولوں

میں رد و بدل کر دینے کا اختیار بھی حاصل ہے۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ اختیار عدالتوں کو کب اور کہاں سے حاصل ہوا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ قانون میں اس طرح کی اصولی تبدیلی کا مجاز آخر ہے کون؟ اس وقت تک مملکت پاکستان کے متعلق دعویٰ یہی ہے کہ یہ مملکت جمہوریت کے اصول پر قائم ہوئی ہے۔ اور جمہوریت کے کوئی معنی نہیں ہیں اگر اس میں باشندوں کی اکثریت کا مشا حکمراں نہ ہو۔ اب اگر پاکستان کے مسلمان باشندوں سے کوئی استصواب عام کرایا جائے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ۹۹۹۹ فی دس ہزار سے بھی زیادہ اکثریت اس عقیدے کا اظہار کرے گی کہ قرآن کے بعد سنت رسول اسلامی قانون کی لازمی بنیاد ہے، اور وہ لوگ شاید پوری طرح دس ہزار میں ایک بھی نہ ہونگے جو اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ صورت حال جب تک موجود ہے۔ کیا اسلامی قانون کے مآخذ میں سے سنت کا اسقاط کر دینا کسی حاکم عدالت کے اختیار میں ہے؟ یا کوئی حکومت ایسا کر سکتی ہے؟ یا کوئی قانون ساز ادارہ اس کا مجاز ہے؟ ان سوالات کا جواب اثبات میں دیا جاسکتا تھا اگر یہاں کسی خاص طبقے کی آمریت قائم ہوتی۔ لیکن جمہوری اصول پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ کوئی شخص ان کا جواب اثبات میں کیسے دے سکتا ہے جس وقت تک یہاں جمہوریت کی قطعی نفی نہیں ہو جاتی کسی ذی اختیار شخص کو اپنے اختیارات اپنی ذاتی ارادے کے مطابق استعمال کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ وہیں اس قانون ہی کے مطابق استعمال کر سکتا ہے جو یہاں اکثریت کی مرضی سے نافذ ہے۔ حکام میں سے جو اصحاب اپنے کچھ بہت زیادہ پر زور خیالات رکھتے ہوں ان کے لیے سیدھا راستہ یہ نکلا ہوا ہے کہ متغی ہو کر اپنی پوری علمی قابلیت عامہ مسلمین کا عقیدہ تبدیل کر کے میں صرف کریں۔ لیکن جب تک وہ کسی با اختیار منصب پر فائز ہیں، وہ اس تبدیلی کے لیے اپنے اختیارات استعمال نہیں کر سکتے۔ یہ جمہوریت کا کھلا ہوا منطقی تقاضا ہے۔ اس سے انکار کے لیے کسی کے پاس اگر کچھ دلائل ہوں تو ہم انہیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں اصولی مسائل کے متعلق جو نقطہ نظر ہم نے اوپر پیش کیا ہے اس کو اگر درست تسلیم کیا جائے۔

کہ فاضل حج کے لیے اپنے ان مخصوص خیالات کو اپنے ایک عدالتی فیصلے میں بیان کرنا مناسب نہ تھا۔ وہ ان کو اپنی شخصی حیثیت میں ایک مضمون کے طور پر تحریر فرماتے اور کسی رسالے میں شائع کر دیتے تو چنداں قابل اعتراض نہ ہوتا۔ اس صورت میں زیادہ آزادی کے ساتھ ان پر بحث ہو سکتی تھی بغیر اس کے کہ احترام عدالت کسی کے لیے آزادی تنقید میں مانع ہو۔

فقہ حنفی کی اصل حیثیت | اب ہم اصل فیصلے کے اصولی مباحث پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں جیسا کہ اس کے مطالعہ سے ناظرین کے سامنے آچکا ہے، یہ حضانت کے ایک مقدمہ کا فیصلہ ہے۔ اس سلسلے میں حضانت کے متعلق فقہ حنفی کے قواعد کا حوالہ دیتے ہوئے فاضل حج یہ فرماتے ہیں کہ انگریزی حکومت کے دور میں پریوی کونسل تک تمام عدالتیں ان قواعد کی پوری پابندی کرتی رہی ہیں، اور اس کی وجہ ان کی راستے میں یہ ہے کہ:

”مسلمان قانون و اس پر یہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریز یا دوسرے غیر مسلم اپنے مقصد کے مطابق قرآن پاک کی تفسیر و تعبیر کریں اور قوانین بنائیں۔ مسلم قانون سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات میں فتاویٰ عالمگیری کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ اسی حقیقت کی عکاس نشان دہی کرتی ہے۔ لیکن اب حالات بالکل بدل چکے ہیں“ (پیرا گراف نمبر ۱)

پھر حضانت کے حنفی قانون کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد وہ دوبارہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ:

”کیا کسی درجہ کی قطعیت کے ساتھ ان قواعد کو اسلامی قانون کہا جاسکتا ہے جسے وہی مقدمہ کا مرتبہ حاصل ہو جو ایک کتاب آئین میں درج شدہ قانون کو حاصل ہوتا ہے؟“ (پیرا گراف ۲)

ہمارے خیال میں یہ راستے ظاہر کرتے وقت فاضل حج کی نگاہ اُن تمام اسباب پر نہیں تھی جن کی بنا پر حنفی قانون نہ صرف انگریزی دور میں اور نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ تیسری صدی ہجری سے دنیا ©rasailojaraid.com حصے میں اسلامی قانون مانا جاتا

رہا ہے۔ انہوں نے اس کے ایک بہت ہی خفیف سے جزوی سبب کا نوٹس لیا ہے، اور اسی بنا پر ان کا یہ ارشاد بھی صحیح صورتِ واقعہ کی ترجمانی نہیں کرتا کہ ”اب حالات بالکل بدل چکے ہیں“۔

اسلامی قانون کی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ خلافتِ راشدہ کی جگہ شاہی طرز حکومت قائم ہو جانے سے اسلامی نظامِ قانون میں ایک بڑا خلا رونما ہو گیا تھا جو ایک صدی سے زیادہ مدت تک موجود رہا۔ خلافتِ راشدہ میں ”شوری“ ٹھیک وہی کام کرتی تھی جو موجودہ زمانہ میں ایک مجلسِ قانون ساز کا کام ہوتا ہے۔ مسلم مملکت میں جو مسائل بھی ایسے پیش آتے تھے جن پر ایک واضح قانونی حکم کی ضرورت ہوتی تھی، خلیفہ کی مجلسِ شوریٰ ان پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں اجتماعی فکر و اجتہاد سے کام لیکر فیصلے کرتی تھی اور وہی فیصلے پوری مملکت میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہوتے تھے۔ قرآن مجید کے کسی فرمان کی تعبیر میں اختلاف ہو، یا سنت رسول کی تحقیق میں، یا کسی نئے پیش آمدہ مسئلے پر اصولِ شریعت کی تطبیق میں مجلسِ شوریٰ کے سامنے ایسا ہر اختلاف ہر وقت پیش ہو جاتا تھا اور اجماع یا کثرتِ رائے سے اس کا جو فیصلہ بھی ہو جاتا وہ قانون بن جاتا تھا۔ خلافتِ راشدہ کی اس مجلس کو یہ حیثیت محض سیاسی طاقت کے بل پر حاصل نہ تھی، بلکہ اس کی اصل وجہ وہ اعتماد تھا جو عام مسلمان خلیفہ اور اس کے اہل شوریٰ کی خدا ترسی، دیانت، خلوص، اور علم دین پر رکھتے تھے۔

جب یہ نظام باقی رہا اور شاہی حکومتوں نے اس کی جگہ لے لی تو فرمانروا اگرچہ مسلمان تھے اور ان کے اعیان حکومت اور اہل دربار بھی مسلمان ہی تھے، لیکن ان میں کوئی بھی یہ جرأت نہ کر سکا کہ مسائل و معاملات میں خلفائے راشدین کی طرح فیصلے دیتا، کیونکہ وہ خود جانتے تھے کہ انہیں عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل نہیں ہے اور ان کے فیصلے قانونِ اسلام کا جز نہیں بن سکتے۔

مسلمانوں کے معتد اہل علم و تقویٰ کی ایک مجلس بناتے اور اس کو وہی آئینی حیثیت دیتے جو اُس شوریٰ کو حاصل تھی، تو ان کی بادشاہی نہ چل سکتی تھی۔ اور اگر وہ اپنے مطلب کے لوگوں کی مجلس شوریٰ بنا کر فیصلے صادر کرنے شروع کر دیتے تو مسلمان ان کے فیصلوں کو شرعی فیصلے ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایسے فیصلے طاقت کے ذریعہ سے مسلط کیے جاسکتے تھے، لیکن انہیں مسلط کرنے والی طاقت جب بھی بٹتی وہ فیصلے اسی جگہ پھینک دیئے جاتے جہاں ان کے نافذ کرنے والے گئے تھے۔ ان کا ایک مستقل جزو شریعت بن کر رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

اس حالت میں اسلامی نظام قانون کے اندر ایک خلا پیدا ہو گیا۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں مسائل و معاملات کے جو فیصلے اجماعی طور پر ہو گئے تھے، وہ تو پوری مملکت کا قانون رہے، لیکن اس کے بعد پیش آنے والے مسائل و معاملات میں ایسا کوئی ادارہ موجود نہ رہا جو قرآن کی تعبیر اور سنت کی تحقیق اور قوت اجتہاد یہ کے استعمال سے ایک فیصلہ دیتا اور وہ مملکت کا قانون قرار پاتا۔ اس دور میں مختلف قاضی اور مفتی اپنے اپنے طور پر جو فتوے اور فیصلے دیتے رہے وہ ان کے دائرہ اثر و اختیار میں نافذ ہوتے رہے۔ ان متفرق فتاویٰ اور فیصلوں سے مملکت میں ایک قانونی طوائف الملوکی پیدا ہو گئی۔ کوئی ایک قانون نہ رہا جو یکسانی کے ساتھ تمام عدالتوں میں نافذ ہوتا اور جس کے مطابق تمام انتظامی محکمے کام کرتے۔ منصور عباسی کے عہد میں ابن المقفع نے اس طوائف الملوکی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا، اور خلیفہ کو مشورہ دیا کہ وہ خود اس خلا کو بھرنے کی کوشش کرے لیکن خلیفہ اپنی حیثیت کو خود جانتا تھا۔ وہ کم از کم اتنا بر خود غلط نہ تھا جتنے آج کل کے ڈکٹیٹر حضرات ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ جو قانون اس کی صدارت میں اس کے نامزد کیے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں نہیں گئے اور اس کے امضاء (SANCTION) سے نافذ ہوں گے

قریب قریب ایک صدی اس حالت پر گزر چکی تھی کہ امام ابو حنیفہ اس خلا کو بھرنے کے لیے آگے بڑھے۔ انہوں نے کسی سیاسی طاقت اور کسی آئینی حیثیت کے بغیر اپنے تربیت کردہ شاگردوں کی ایک غیر سرکاری مجلس قانون ساز (PRIVATE LEGISLATURE) بنائی۔ اس میں قرآن کے احکام کی تعبیر سنتوں کی تحقیق، سلف کے اجماعی فیصلوں کی تلاش و جستجو، ہماہ و تابعین اور تبع تابعین کے فتاویٰ کی جانچ پڑتال، اور معاملات و مسائل پر اصول شریعت کی تطبیق کا کام بڑے وسیع پیمانے پر کیا گیا، اور پچیس تیس سال کی مدت میں اسلام کا پورا قانون مدون کر کے رکھ دیا گیا۔ یہ قانون کسی بادشاہ کی رضا سے مدون نہیں کیا گیا تھا۔ کوئی طاقت اس کی پشت پر نہیں تھی جس کے زور سے یہ نافذ ہوتا۔ لیکن پچاس برس بھی نہ گزرے تھے کہ یہ سلطنت عباسیہ کا قانون بن گیا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس کو ان لوگوں نے مرتب کیا تھا جن کے متعلق عام مسلمانوں کو یہ اعتماد تھا کہ وہ عالم بھی ہیں اور متقی و محتاط بھی، وہ قرآن اور سنت کو ٹھیک ٹھیک سمجھتے اور جانتے ہیں، صحیح اسلامی ذہن رکھتے ہیں، غیر اسلامی افکار و نظریات سے متاثر نہیں ہیں۔ اور اسلامی قانون کی تدوین میں اپنے یا کسی کے ذاتی مفادات، رجحانات، یا خواہشات کو ذرا برا بردخل دینے والے نہیں ہیں۔ مسلمان ان پر پورا اطمینان رکھتے تھے کہ یہ تحقیق و اجتہاد کے بعد شریعت کا جو حکم بھی بیان کریں گے، ان میں بشر و غلطی ہو سکتی ہے، مگر بے ڈھب اور بے نظام اجتہاد یا اسلام میں غیر اسلام کی آمیزش کا ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس خالص اخلاقی طاقت کا یہ کرشمہ تھا کہ پہلے بلاد مشرق کے عام مسلمانوں نے آپ سے آپ اس کو اسلام کا قانون مان لیا اور اپنے معاملات میں بطور خود اس کی پیروی شروع کر دی۔ پھر سلطنت عباسیہ کو اسے تسلیم کر کے ملک کا قانون قرار دینا پڑا۔ اس کے بعد وہی قانون اپنی اسی طاقت سے مغرب میں ترکی سلطنت کا اور مشرق میں ہندوستان کی مسلم حکومت کا قانون بنا۔

۱۔ امام ابو حنیفہ کے بعد تدوین قانون اسلامی کا دوسرا کا نامہ امام مالک نے انجام دیا اور وہ بھی محض اپنی اخلاقی طاقت کے زور سے اندلس اور شمالی مغربی افریقہ کا قانون بن گیا۔ پھر امام شافعی اور ان کے

بعد کی بہت سی صدیوں میں یہ قانون اُسی مقام پر کھڑا نہیں رہا جہاں امام ابوحنیفہ نے اسے چھوڑا تھا، بلکہ ہر صدی میں اس کے اندر بہت سی ترمیمات بھی ہوتی ہیں، اور بہت سے نئے مسائل کے فیصلے بھی اس میں شامل ہوتے رہے ہیں، جیسا کہ کتبِ خطا ہر الروایۃ اور بعد کی کتبِ فتاویٰ کے تقابل سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بعد کا سارا کام بھی حکومت کے ایوانوں سے باہر مدرسوں اور دارالافتاؤں میں ہی ہوتا رہا، کیونکہ مسلمان بادشاہوں اور ان کے مسلمان امراء حکام کے علم و تقویٰ پر مسلمان عوام کوئی اعتماد نہ رکھتے تھے۔ انہیں صرف خدا ترس علماء پر ہی اعتماد تھا، اس لیے انہی کے فتوے اس قانون کے جزد بنتے رہے اور انہی کے ہاتھوں اس کا ارتقا ہوتا رہا۔ ایک دو شاہوں کو چھوڑ کر اس پورے زمانے میں کسی بد دماغ سے بد دماغ بادشاہ کو بھی اپنے متعلق یہ غلط فہمی نہیں ہوتی کہ میں ایک قانون بناؤں گا اور مسلمان اسے شریعت مان لیں گے۔ اور نگ زیب جیسے پرہیزگار فرمانروا نے بھی وقت کے نامور علماء ہی کو جمع کیا جنہیں مسلمان دینی حیثیت سے بھروسے کے قابل سمجھتے تھے، اور ان کے ذریعہ سے اس نے فقہاء حنفیہ ہی کے فتاویٰ کا مجموعہ مرتب کرا کے اس کو قانون قرار دیا۔

اس بحث سے تین باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں :

ایک یہ کہ فقہ حنفی، جو انگریزوں کی آمد سے صدیوں پہلے سے مشرقی مسلمان مملکتوں کا قانون تھی، اور جسے آکر انگریز بھی اپنے پورے دور میں کم از کم پرنسپل لا کی حد تک مسلمانوں کا قانون تسلیم کرتے رہے، دراصل مسلمانوں کی عام رضا اور پسند سے قانون قرار پائی تھی۔ اس کو کسی سیاسی بعد امام احمد بن حنبل نے خالص غیر سرکاری حیثیت میں قوانین اسلامی کی تدوین کی اور یہ دونوں بھی محض عام مسلمانوں کی رضا سے متعدد مسلمان ریاستوں کے قوانین قرار پا گئے۔ اسی طرح زیدی اور جعفری فقہیں بھی انہیں نے اپنی پراپیوٹ حیثیت میں مرتب کیں اور وہ بھی صرف اپنی اخلاقی طاقت سے شیعہ ریاستوں کا قانون نہیں پھر اہل الحدیث کے مسلک پر جو فقہی احکام مرتب ہوئے ان کو بھی کسی سیاسی اثر کے بغیر لاکھوں مسلمانوں نے اپنی زندگی کا قانون اپنی مرضی سے بنایا بغیر © rasailojaraid.com کے مشتہر ہوتا۔

طاقت نے نافذ (ENFORCE) نہیں کیا تھا بلکہ ان ممالک کے جمہور مسلمین اسی کو اسلامی قانون مان کر اس کی پیروی کرتے تھے اور حکومتوں نے اسے اس لیے قانون مانا کہ ان ملکوں کے عام مسلمان اس کے سوا کسی دوسری چیز کی پیروی قلب و ضمیر کے اطمینان کے ساتھ نہ کر سکتے تھے۔

دوسرے یہ کہ مسلمان جس طرح انگریزی دور میں اپنا دین اور اپنی شریعت انگریزوں اور دوسرے غیر مسلموں کے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار نہ تھے، اسی طرح وہ بنی امیہ کے زمانے سے لے کر آج تک کبھی ایسے مسلمانوں کے ہاتھ میں بھی انہیں دینے کے لیے تیار نہیں رہے ہیں جن کے علم دین اور تقویٰ اور امتیاط پر ان کو اطمینان نہ ہو۔

تیسرے یہ کہ اب حالات بالکل کیا معنی، بالآخر بھی نہیں بدلے ہیں۔ انگریزوں کی جگہ بس مسلمانوں کا گری نشین ہو جانا بجائے خود اپنے اندر کوئی جوہری فرق نہیں رکھتا۔ خلافت راشدہ کے بعد جو خلافت پیدا ہوا تھا، مسلمان حکومتوں کی حد تک وہ اب بھی جوں کا توں باقی ہے اور وہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک ہمارا نظام تعلیم ایسے خدا ترس فقیہ پیدا نہ کرنے لگے جن کے علم و تقویٰ پر مسلمان اعتماد کر سکیں، اور ہمارا نظام سیاست ایسا بن جائے کہ اس طرح کے معتمد علیہ اصحاب ہی ملک میں قانون سازی کے منصب پر فائز ہونے لگیں۔ اگر اس ملک میں ہمیں قوم کے ضمیر اور قانون کے درمیان تضاد اور تصادم پیدا کرنا نہیں ہے تو جب تک یہ خلافت واقعی صحیح طریقہ سے بھر نہ جائے، اسے خام مواد سے بھرنے کی کوئی کوشش نہ کرنی چاہیے۔

فاضل حج کے بنیادی تصورات | اس کے بعد پیرا گراف ۸ سے ۶ تک فاضل حج نے اسلامی قانون کے متعلق اپنے کچھ تصورات بنیاد غراستے ہیں جو علی الترتیب سب ذیل ہیں:

۱، اسلام کی رو سے جو قانون ایک مسلمان پر اس کی زندگی کے ہر شعبے میں حکمراں ہونا چاہیے، خواہ وہ اس کی زندگی کا مذہبی شعبہ ہو یا سیاسی، یا معاشرتی یا معاشی، وہ صرف خدا کا قانون ہے۔

(۲) قرآن نے جو حدود مقرر کر دیئے ہیں ان کے اندر مسلمانوں کو سوچنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔

(۳) چونکہ قانون انسانی آزادی پر پابندی عائد کرنے والی طاقت ہے اس لیے خدا نے قانون سازی کے اختیارات پوری طرح اپنے ہاتھ میں لیے ہیں۔ اسلام میں کسی شخص کو اس طرح کام کرنے کا اختیار نہیں ہے کہ گویا وہ دوسروں سے بالاتر ہے۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا طرز عمل یہ تھا کہ جو کچھ وہ کرتے تھے مسلمانوں کے مشورے سے کرتے تھے۔ اسلام کا عقیدہ عین اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک انسان کی دوسرے انسانوں پر برتری کی انہی کرتا ہے۔ وہ اجتماعی فکر اور اجتماعی عمل کی راہ دکھاتا ہے۔

(۵) اس دنیا میں چونکہ انسانی حالات اور مسائل بدلتے رہتے ہیں، اس لیے اس بدلتی ہوئی دنیا کے اندر مستقل، ناقابل تغیر و تبدل احکام و قوانین نہیں چل سکتے۔ خود قرآن بھی اس عام قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے مختلف معاملات میں چند وسیع اور عام قاعدے انسانی ہدایت کے لیے دے دیئے ہیں۔

(۶) قرآن سادہ اور آسان زبان میں ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ اس کا پڑھنا اور سمجھنا ایک دو آدمیوں کا مخصوص حق نہیں ہے۔ تمام مسلمان اگر چاہیں تو اسے سمجھ سکتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔ یہ حق تمام مسلمانوں کو دیا گیا ہے اور کوئی اسے ان سے سلب نہیں کر سکتا، خواہ وہ کیسا ہی عالی مرتبہ اور کیسا ہی فاضل کیوں نہ ہو۔

(۷) قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے میں یہ بات خود متضمن ہے کہ آدمی اس کی تعبیر کرے۔ اور اس کی تعبیر کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آدمی اس کو وقت کے حالات پر اور دنیا کی بدلتی ہوئی ضروریات پر منطبق کرے۔

(۸) امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور قدیم زمانے کے دوسرے مفسرین

نئے قرآن کی جو تعبیریں کی تھیں وہ آج کے زمانہ میں جوں کی توں نہیں مانی جاسکتیں۔ سو سائٹی کے بدلتے ہوئے حالات پر قرآن کے عام اصولوں کو منطبق کرنے کے لیے ان کی دانشمندانہ تعبیر کرنی ہوگی، اور ایسے طریقے سے تعبیر کرنی ہوگی کہ لوگ اپنی تقدیر اور اپنے خیالات اور اخلاقی تصورات کی تشکیل اس کے مطابق کر سکیں، اور اپنے ملک اور زمانے کے لیے موزوں ترین طریقے پر کام کر سکیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح مسلمان بھی عقل اور ذہانت رکھتے ہیں۔ اور یہ طاقنت استعمال کرنے ہی کے لیے دی گئی ہے۔ تمام مسلمانوں کو قرآن پڑھنا، سمجھنا اور اس کی تعبیر کرنا ہوگا۔

۹، قرآن کو سمجھنے اور اس کے مدعا کو پانے کی سخت کوشش ہی کا نام اجتہاد ہے۔ قرآن سب مسلمانوں سے، نہ کہ ان کے کسی خاص طبقے سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ اس کا علم حاصل کریں۔ اسے اچھی طرح سمجھیں اور اس کی تعبیر کریں۔

(۱۰) اگر ہر شخص انفرادی طور پر بطور خود قرآن کی تعبیر کرے تو بے شمار مختلف تعبیرات وجود میں آجائیں گی جن سے سخت بد نظمی کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح جن معاملات میں قرآن ساکت ہے۔ اگر ان کے بارے میں ہر شخص کو ایک قاعدہ بنا لینے اور ایک طرز عمل طے کر لینے کا اختیار ہو تو ایک پراگندہ اور غیر مربوط سو سائٹی پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بڑی تعداد کی رائے کو نافذ ہونا چاہیے۔

(۱۱) ایک آدمی یا چند آدمی فطرۃ عقل اور قوت میں ناقص ہوتے ہیں۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی طاقتور اور ذہین ہو، اس کے کامل ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ لاکھوں کروڑوں آدمی، جو اجتماعی زندگی ایک نظم کے ساتھ بسر کر رہے ہوں، اپنی اجتماعی ہیئت میں افراد کی بہ نسبت زیادہ عقل اور طاقت رکھتے ہیں۔ قرآن کی رو سے بھی کتاب اللہ کی تعبیر اور حالات پر اس کے عام اصولوں کا انطباق ایک آدمی یا چند آدمیوں پر نہیں چھوڑا جاسکتا بلکہ یہ کام مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے ہوگا۔

(۱۲) قانون سے مراد وہ ضابطہ ہے جس کے متعلق لوگوں کی اکثریت یہ خیال کرتی ہو کہ لوگوں کے معاملات اس کے مطابق چلنے چاہئیں۔ کئی کروڑ باشندوں کے ایک ملک میں باشندوں کی اکثریت کو قرآن کی اُن آیات کی جن کے اندر دو یا زائد تعبیروں کی گنجائش ہو ایک ایسی تعبیر کرنی چاہیے جو ان کے حالات کے لیے موزوں ترین ہو۔ اور اسی طرح انہیں قرآن کے عام اصولوں کو حالات موجودہ پر منطبق کرنا چاہیے تاکہ فکر و عمل میں یکسانی و وحدت پیدا ہو سکے۔ اسی طرح یہ اکثریت کا کام ہے کہ ان مسائل و معاملات میں جن پر قرآن ساکت ہے، کوئی قانون بنائے۔

(۱۳) قدیم زمانے میں تو شاید یہ درست تھا کہ اجتہاد کو چند فقہاء تک محدود کر دیا جائے۔ کیونکہ لوگوں میں آزادانہ اور عمومیت کے ساتھ علم نہیں پھیلا یا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانے میں یہ فریضہ باشندوں کے نمائندوں کو انجام دینا چاہیے، کیونکہ قرآن کا پڑھنا اور سمجھنا اور اس کے عام اصولوں کو حالات پر منطبق کرنا ایک یا دو اشخاص کا مخصوص استحقاق نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کا فرض اور حق ہے، اور یہ کام ان لوگوں کو انجام دینا چاہیے جنہیں عام مسلمانوں نے اس مقصد کے لیے منتخب کیا ہو۔

تصویرات مذکورہ پر تنقید اوپر کے تیرہ فقروں میں ہم نے اپنی حد تک پوری کوشش کی ہے کہ فاضل نج کے تمام بنیادی نظریات کا ایک صحیح خلاصہ بیان کر دیں۔ اُن کی زبان اور سلسلہ وار ترتیب میں بھی ہم نے موصوف کی اپنی زبان اور منطقی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے، تاکہ ناظرین کے سامنے اُن خیالات کی صحیح صورت آجائے جن پر آگے واپس فیصلے کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ ان بنیادی نظریات میں چند باتیں قابل غور اور لائق تنقید ہیں۔

اولاً، فاضل نج کی نگاہ میں خدا کے قانون سے مراد صرف وہ قانون ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔ سنت جو احکام و ہدایات دیتی ہے انہیں وہ خدا کے قانون میں شمار نہیں کرتے۔ اوپر کے فقروں میں یہ غلطی ہے۔ لیکن آگے چل کر اپنے فیصلے میں وہ اس کی

صراحت کرتے ہیں۔ اور اسی مقام پر ہم اس نقطہ نظر کی غلطی واضح کریں گے۔

ثانیاً، وہ جب کہتے ہیں کہ کسی انسان کو بھی دوسرے انسانوں پر برتری حاصل نہیں ہے، اور یہ کہ قرآن کو سمجھنا اور اس کی تعبیر کرنا چند انسانوں کا مخصوص حق نہیں ہے، تو اس میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ یہ چیز بھی مذکورہ بالا فقرات میں نمایاں نہیں ہے، لیکن آگے چل کر اس کی تصریح انہوں نے خود کر دی ہے، لہذا ان کا یہ قاعدہ کلیہ بھی محتاج تنقید ہے۔

ثالثاً، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کو ایک درجہ میں رکھ کر یہ فرمایا ہے کہ ”جو کچھ وہ کرتے تھے مسلمانوں کے مشورے سے کرتے تھے“ یہ بات قطعاً خلاف واقعہ ہے۔ رسول کی حیثیت اپنی نوعیت میں خلفائے راشدین سمیت تمام امراء مسلمین کی حیثیت سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ہے۔ حضور کو ان کے ذمے میں رکھنا خود اس قرآن کے خلاف ہے جسے نما غفل حج نے خدا کا قانون تسلیم کیا ہے۔ پھر ان کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ خلفائے راشدین کی طرح حضور بھی جو کچھ کرتے تھے مسلمانوں کے مشورے سے کرتے تھے۔ جن امور میں حضور کو خدا کی طرف سے ہدایت ملتی تھی ان میں آپ کا کام صرف حکم دینا اور مسلمانوں کا کام صرف اطاعت کرنا تھا۔ ان کے اندر مشورے کا کیا سوال، کسی مسلمان کو بوسنے کا حق بھی نہ تھا۔ اور خدا کی ہدایت حضور کے پاس لازماً قرآنی آیات ہی کی شکل میں نہیں آتی تھیں بلکہ وہ وحی غیر متلو کی شکل میں بھی آتی تھیں۔

رابعاً، فاضل حج نے عام مسلمانوں کے حق اجتہاد پر زور دینے کے بعد خود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک منظم معاشرے میں انفرادی اجتہاد نہیں چل سکتا، قانون صرف وہی اجتہاد بنے گا جو اکثریت کے نمائندوں نے کیا، سو۔ سوال یہ ہے کہ اکثریت کا چند آدمیوں کو منتخب کر کے اجتہاد کا اختیار دینا، اور اس کا چند آدمیوں پر اعتماد کر کے ان کے اجتہاد کو قبول کر لینا، کیا فرق ہے؟ اس ملک کی عظیم

اکثریت نے اگر تمہارے خفیہ پر اعتماد کر کے ان کی تعبیر قرآن و سنت اور ان کے اجتہادات کو اسلامی قانون مانا ہے تو فاضل حج خود اپنے بیان کردہ اصول کی روش سے اس پر کیا اعتراض کر سکتے ہیں اور کیسے کر سکتے ہیں؟ ان پر تو مسلمانوں کے اعتماد کا یہ حال رہا ہے کہ جب اس قانون کو نافذ کرتے والی کوئی طاقت نہ رہی تھی اور غیر مسلم برسرِ اقتدار اچکے تھے اس وقت بھی مسلمان اپنے گھروں میں اور اپنی شخصی و معاشرتی زندگی کے معاملات میں ان کے بیان کردہ قانون ہی کی پیروی کرتے رہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عام مسلمان کسی جبر کے بغیر خدیصہ دل کے ساتھ اور غلبہ و ضمیر کے پورے اطمینان کے ساتھ اس کو صحیح قانون سمجھتے ہیں۔ کیا دنیا کی کسی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کو اس قدر زبردست جہوریہ تائید حاصل ہونے کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ اس کے مقابلہ میں کسی ایک شخص کا خواہ وہ ایک فاضل حج ہی کیوں نہ ہو، یہ استدلال کیا وزن رکھتا ہے کہ ان فقہاء کی تعبیری آج کے زمانے میں نہیں مانی جاسکتی؟ جسٹس محمد رفیع صاحب خود فرماتے ہیں کہ قانون وہ ہے جسے اکثریت مانے۔ سو اکثریت اس قانون کو مان رہی ہے۔ آخر کس دلیل سے ان کی انفرادی رائے اسے رد کر سکتی ہے؟

خاصاً، فاضل حج ایک طرف خود تسلیم کرتے ہیں کہ قانون بنانا اور ان میں رد و بدل کرنا اکثریت کے غاصبوں کا کام ہے۔ افراد کا کام نہیں ہے، خواہ وہ بجائے خود ایسے ہی طاقتور اور ذہین ہوں لیکن دوسری طرف انہوں نے خود ہی اکثریت کے تسلیم کردہ اصول قانون میں ترمیم بھی کی ہے، اور حضرات کے متعلق اکثریت کے مسئلہ قانون کو رد بھی کیا ہے۔ اگر یہ تضاد نہیں ہے تو ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوگی کہ ان دنوں باتوں میں کس طرح قطعیت دی جاسکتی ہے۔

اجتہاد کے چند نمونے اس کے بعد پیرا گراف ۶ تا ۲۰ میں فاضل حج نے خود قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر کے لیے پیش کیا ہے © rasailojaraid.com میں جن سے وہ یہ

بتانا چاہتے ہیں کہ اس زمانے میں قوتِ اجتہاد یہ کواستعمال کر کے قرآن سے کس طرح احکام نکالے جانے چاہئیں۔

تعدد ازواج کے مسئلے میں فاضل حج کا اجتہاد | اس سلسلہ میں وہ سب سے پہلے سو
نساء کی تیسری آیت **وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَمِينِ فَأَنْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ**
النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ کو لیتے ہیں جس کے متعلق ان کا ارشاد ہے کہ ”اسے اکثر
غلط استعمال کیا گیا ہے“ اس آیت پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے وہ پہلی بات یہ فرماتے
ہیں کہ :

”قرآن پاک کے کسی حکم کا کوئی جز بھی فضول یا بے معنی نہ سمجھا جانا چاہیے۔“

لیکن اس کے فوراً ہی بعد دوسرا فقرہ یہ ارشاد فرماتے ہیں :

”یہ لوگوں کے منتخب نمائندوں کا کام ہے کہ وہ اس بارے میں ایک

قانون بنائیں کہ آیا ایک مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں کر سکتا ہے، اور اگر کر سکتا

ہے تو کن حالات میں اور کن شرائط کے ساتھ۔“

اس اجتہاد کی پہلی غلطی | تعجب ہے کہ فاضل حج کو اپنے ان دونوں فقروں میں تضاد

کیوں نہ محسوس ہوا۔ پہلے فقرے میں جو اصولی بات انہوں نے خود بیان فرمائی ہے اس

کی رو سے زیر بحث آیت کا کوئی لفظ زائد از ضرورت یا بے معنی نہیں ہے۔ اب دیکھیے :

آیت کے الفاظ صاف تبار ہے ہیں کہ اس کے مخاطب افرادِ مسلمین ہیں۔ ان سے کہا جا

رہا ہے کہ ”اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تمہیں کے معاملہ میں تم انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں

تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو، دو دو سے، تین تین سے اور چار چار سے، لیکن اگر

تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی سہی ۔۔۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ عورتوں کو پسند

کرنا، ان سے نکاح کرنا اور اپنی بیویوں سے عدل کرنا یا نہ کرنا افراد کا کام ہے نہ کہ پوری

قوم یا سوسائٹی کا۔ لہذا باقی تمام فقرے بھی جو اصنع جمع مخاطب ارشاد ہوئے ہیں ان کا

خطاب بھی لامحالہ افراد ہی سے ماننا پڑے گا۔ اس طرح یہ پوری آیت اول سے لیکر آخر تک دراصل افراد کو ان کی انفرادی حیثیت میں مخاطب کر رہی ہے، اور یہ بات انہی کی مرضی پر چھوڑ رہی ہے کہ اگر عدل کر سکیں تو چار کی حد تک جتنی عورتوں کو پسند کریں ان سے نکاح کریں، اور اگر یہ خطرہ محسوس کریں کہ عدل نہ کر سکیں گے تو ایک ہی پر اکتفا کریں۔ سوال یہ ہے کہ جب تک ناکھو اما طاب لکمہ اور فان خفتنم الا تعدلوا کے صبیغہ خطاب کو فضول اور بے معنی نہ سمجھ لیا جائے، اس آیت کے ڈھانچے میں نمائندگان قوم کس راستے سے داخل ہو سکتے ہیں؟ آیت کا لفظ ان کے لیے مداخلت کا دروازہ کھولتا ہے؛ اور مداخلت بھی اس حد تک کہ وہی اس امر کا فیصلہ بھی کریں کہ ایک مسلمان دوسری بیوی کر بھی سکتا ہے یا نہیں، حالانکہ کر سکنے کا مجاز اسے اللہ تعالیٰ نے خود بالفاظ سرخ کر دیا ہے، اور پھر ”کر سکنے“ کا فیصلہ کرنے کے بعد وہی یہ بھی طے کریں کہ ”کن حالات میں اور کن شرائط کے مطابق کر سکتا ہے“ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز فرد کے اپنے انفرادی فیصلے پر چھوڑی ہے کہ اگر وہ عدل کی طاقت اپنے اندر پاتا ہو تو ایک سے زائد کرے ورنہ ایک ہی پر اکتفا کرے۔

دوسری غلطی دوسری بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ ”ازراہ قیاس ایسی شادی کو دینی آیت سے زائد بیویوں کے ساتھ شادی کو انیمیوں کے فائدے کے لیے ہونا چاہیے“ یہ وہی عام غلطی ہے جو اس آیت کا مطلب لینے میں جدید زمانے کے بعض لوگ کر رہے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ آیت میں چونکہ تیامی کے ساتھ انصاف کا ذکر آگیا ہے، اس لیے لامحالہ ایک سے زائد بیویاں کرنے کے معاملہ میں کسی نہ کسی طرح تیامی کا معاملہ بطور ایک لازمی شرط کے شامل ہونا چاہیے۔ حالانکہ اگر اس بات کو ایک قاعدہ کلیہ بنا لیا جائے کہ قرآن میں کسی خاص موقع پر جو حکم دیا گیا ہو اور اس موقع کا ذکر بھی ساتھ ساتھ کر دیا گیا ہو، وہ حکم صرف اسی موقع کے لیے خاص ہوگا تو اس سے بڑی قباحتیں لازم آئیں گی۔ مثلاً عرب کے لوگ اپنی لونڈیوں کو پیشہ کمانے پر زبردستی مجبور کرتے تھے۔ قرآن نے اس کی ممانعت نہ کی کہ لَا تُکْرِهُوا فَتَاتِکُمْ عَلٰی بُعَا

اِنَّ اَرَدْتَ تَخَصُّصًا: اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ بچی رہنا چاہتی ہوں (النور ۱۳۳)۔ کیا یہاں ازراہ قیاس یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ حکم صرف لونڈیوں سے متعلق ہے، اور یہ کہ لونڈی اگر خود بدکار رہنا چاہتی ہو تو اس سے پیشہ کرایا جاسکتا ہے؟

دراصل اس طرت کی قیود کا واقعاتی پس منظر جب تک نگاہ میں نہ ہو، آدمی قرآن مجید کی ایسی آیات کو، جن میں کوئی حکم بیان کرتے ہوئے کسی خاص حالت کا ذکر کیا گیا ہے، خشک نہیں سمجھ سکتا۔ آیت **وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَا تَفْسِطُوْا فِی الْیَمٰیْنِ** کا واقعاتی پس منظر یہ ہے کہ عرب میں اور قدیم زمانے کی پوری سوسائٹی میں، صد ہا برس سے تعدد ازواج مطلقاً مباح تھا۔ اس کے لیے کوئی سی اجازت دینے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ قرآن کا کسی رواج عام سے منع نہ کرنا خود ہی اس رواج کی اجازت کا ہم معنی تھا۔ اس لیے فی الحقیقت یہ آیت تعدد ازواج کی اجازت دینے کے لیے نازل نہیں ہوئی تھی، بلکہ جنگ اُحد کے بعد جو بہت سی عورتیں کئی کئی بچوں کے ساتھ بیوہ رہ گئی تھیں، ان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ اس میں مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ اگر شہدائے اُحد کے یتیم بچوں کے ساتھ تم یوں انصاف نہیں کر سکتے تو تمہارے لیے ایک سے زائد بیویاں کرنے کا دروازہ پہلے ہی کھد ہوا ہے، ان کی بیوہ عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان کے ساتھ نکاح کر لو تا کہ ان کے بچے تمہارے اپنے بچے بن جائیں اور تمہیں ان کے مفاد سے ذاتی دلچسپی پیدا ہو جائے۔ اس سے یہ نتیجہ کسی منطق کی رو سے بھی نہیں نکالا جاسکتا کہ تعدد ازواج صرف اُسی حالت میں جائز ہے جبکہ یتیم بچوں کی پرورش کا مسئلہ درپیش ہو۔ اس آیت نے اگر کوئی نیا قانون بنایا ہے تو وہ تعدد ازواج کی اجازت دینا نہیں ہے، کیونکہ اس کی اجازت تو پہلے ہی تھی اور معاشرے میں ہزاروں برس سے اس کا رواج موجود تھا، بلکہ دراصل اس میں جو نیا قانون دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ بیویوں کی تعداد پر چار کی قید لگا دی گئی ہے جو پہلے نہ تھی۔

تیسری غلطی | تیسری بات قاضی حج یہ فرماتے ہیں کہ ”اگر ایک مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ میں

ایک سے زیادہ بیویاں نہیں کر دینا کیونکہ میں اس کی استطاعت نہیں رکھتا، تو وہ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت بھی ساری قوم کے لیے یہ قانون بنا سکتی ہے کہ قوم کی معاشی، تمدنی اور سیاسی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کا کوئی فرد ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔ اس عجیب طرز استدلال کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ ایک مسلمان جب یہ کہتا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرے گا تو وہ اس آزادی کو استعمال کرتا ہے جو اس کی خانگی زندگی کے بارے میں خدا نے اسے دی ہے۔ وہ اس آزادی کو شادی نہ کرنے کے بارے میں بھی استعمال کر سکتا ہے؛ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنے میں بھی استعمال کر سکتا ہے، بیوی مر جائے تو دوسری شادی کرنے یا نہ کرنے میں بھی استعمال کر سکتا ہے، اور کسی وقت اس کی راستے بدل جائے تو ایک سے زائد بیویاں کرنے کا فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن جب قوم تمام افراد کے بارے میں کوئی مستقل قانون بنا دیگی تو فرد سے اس کی وہ آزادی سلب کرے گی جو خدا نے اسے دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسی تپاس پر کیا قوم کسی وقت یہ فیصلہ کرنے کی بھی مجاز ہے کہ اس کے آدھے افراد شادی کریں اور آدھے نہ کریں؟ یا جس کی بیوی یا شوہر مرتے ہیں وہ نکاح ثانی نہ کرے؟ ہر آزادی جو افراد کو دی گئی ہے اسے بناتے استدلال بنا کر قوم کو یہ آزادی دینا کہ وہ افراد سے ان کی آزادی سلب کرے، ایک منطقی مغالطہ تو ہو سکتا ہے، مگر ہمیں یہ نہیں معلوم کہ قانون میں یہ طرز استدلال کب سے مقبول ہوا ہے۔

تاہم تھوڑی دیر کے لیے ہم یہ مانے بیٹے ہیں کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت مثلاً ان میں سے ہم کروڑ ایک ہزار مل کر ایسا کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آٹھ کروڑ مسلمانوں میں سے صرف چند ہزار مل کر اپنی ذاتی راستے سے اس طرح کا کوئی قانون تجویز کریں اور اکثریت کی راستے کے خلاف اسے مسلط کر دیں تو فاضل حج کے بیان کردہ اصول کی رو سے اس کا کیا جواز ہو گا؟ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی آبادی میں سے ایک لاکھ، بکچہ پچاس ہزار کا بھی نقطہ نظر یہ نہیں ہے کہ قوم کی معاشی، تمدنی اور سیاسی حالت اس امر کا تقاضا

کرتی ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ایک سے زائد بیویاں رکھنا تو قانوناً ممنوع ہوا البتہ اُس کا ”گرل فرینڈس“ سے آزادانہ تعلق، یا طوائفوں سے ربط ضبط، یا مستقل داشتہ رکھنا از روئے قانون جائز رہے۔ خود وہ عورتیں بھی جن کے لیے سوکن کا تصور ہی تکلیف دہ ہے، کم ہی ایسی ہونگی جن کے نزدیک ایک عورت سے ان کے شوہر کا نکاح ہو جاتے تو ان کی زندگی سستی سے بدتر ہو جاتے گی، لیکن اسی عورت سے ان کے شوہر کا ناجائز تعلق رہے تو ان کی زندگی جنت کا نمونہ بنی رہے گی۔

چوتھی غلطی | پھر فاضل حج فرماتے ہیں:

”اس آیت کو قرآن کی دوسری دو آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔ ان

میں سے پہلی آیت سورہ نور نمبر ۳۲ ہے جس میں طے کیا گیا ہے کہ جو لوگ شادی کرنے کے

ذرائع نہ رکھتے ہوں ان کو شادی نہ کرنی چاہیے۔ اگر ذرائع کی کمی کے باعث ایک

شخص کو ایک بیوی کرنے سے روکا جاسکتا ہے تو انہی وجوہ یا ایسے ہی وجوہ کی بنا پر

اسے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے سے روک دیا جانا چاہیے۔“

یہاں پھر موصوف نے خود اپنے بیان کردہ اصول کو توڑ دیا ہے۔ آیت کے اصل

الفاظ یہ ہیں:

وَلَيْسَتْ غَنِيَّةٍ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ۔

”اور عفت مآبی سے کام لیں وہ لوگ جو نکاح کا موقع نہیں پاتے یہاں تک کہ

اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے۔“

ان الفاظ میں یہ مفہوم کہاں سے نکلتا ہے کہ ایسے لوگوں کو نکاح نہ کرنا چاہیے؟ اگر

قرآن کی کسی آیت کے الفاظ کو فضول اور بے معنی سمجھنا درست نہیں ہے تو نکاح سے منع

کر دینے کا تصور اس آیت میں کسی طرح داخل نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ

جب تک اللہ نکاح کے ذرائع فراہم نہ کر دے اس وقت تک مجرد لوگ عفت مآب بن کر رہیں

بدکاریاں کر کے نفس کی تسکین نہ کرتے پھر یہ تاہم اگر کسی نہ کسی طرح نکاح سے منع کر دینے کا مفہوم ان الفاظ میں داخل کر بھی دیا جاتے، پھر بھی اس کا روئے سخن فرد کی طرف ہے نہ کہ قوم یا ریاست کی طرف۔ یہ بات فرد کی اپنی صوابدید پر چھوڑی گئی ہے کہ کب وہ اپنے آپ کو شادی کر لینے کے قابل پاتا ہے اور کب نہیں پاتا۔ اور اسی کو یہ ہدایت ملی گئی ہے اگر فی الواقع ایسی کوئی ہدایت ملی بھی گئی ہے، کہ جب تک وہ نکاح کے ذرائع نہ پاتے نکاح نہ کرے۔ اس میں ریاست کو یہ حق کہاں دیا گیا ہے کہ وہ فرد کے اس ذاتی معاملہ میں دخل دے اور یہ قانون بنائے کہ کوئی شخص اس وقت تک نکاح نہ کرنے پاتے جب تک وہ ایک عدالت کے سامنے اپنے آپ کو ایک بیوی اور گنتی کے چند بچوں کی دجن کی تعداد مقرر کر دینے کا حق بھی فاضل حج کی راستے میں یہی آیت ریاست کو عطا کرتی ہے، پرورش کے قابل ثابت نہ کر دے؟ آیت کے الفاظ اگر ”فضول اور بے معنی“ نہیں ہیں تو اس معاملہ میں ریاست کی قانون سازی کا جواز ہمیں بتایا جائے کہ اس کے کس لفظ سے نکلتا ہے؟ اور اگر نہیں نکلتا تو اس آیت کی بنیاد پر مزید پیش قدمی کر کے ایک سے زائد بیویوں اور مقررہ تعداد سے زائد بچوں کے معاملہ میں ریاست کو قانون بنانے کا حق کیسے دیا جاسکتا ہے؟

پانچویں غلطی | دوسری آیت جسے سورہ نساء کی آیت نمبر ۳ کے ساتھ ملا کر پڑھنے اور اس سے ایک حکم نکالنے کی فاضل حج نے کوشش فرمائی ہے وہ سورہ نساء کی آیت ۱۲۹ ہے۔ اس کا صرف حوالہ دینے پر انہوں نے اکتفا نہیں فرمایا ہے بلکہ اس کے الفاظ انہوں نے خود نقل کر دیئے ہیں، اور وہ یہ ہیں:

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا اَنْ تَعْدُوا بَيْنَ الْاِنْسَادِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوْا
كُلَّ الْمِيلِ فَنُكِلُوهَا كَالْمُلْحَقَةِ وَاِنْ نَّصْلِحُوْا وَنَنْقُضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ
كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا -

”اور تم ہرگز یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ عدالتوں کے درمیان بیچوں کے

درمیان، خواہ تم اس کے کیسے ہی خواہشمند ہو۔ لہذا ایک بیوی کی طرف، بالکل نہ جھک پڑو کہ دوسری کو معلق چھوڑ دو۔ اور اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ یقیناً درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔

ان الفاظ کی بنیاد پر فاضل حج پہلے تو یہ فرماتے ہیں کہ ”اللہ تعالیٰ نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کرنا انسانی ہستیوں کے بس میں نہیں ہے۔ پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ”یہ ریاست کا کام ہے کہ ان دونوں آیتوں میں تطبیق دینے کے لیے ایک قانون بناتے اور ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر پابندیاں عائد کر دے۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ دو بیویاں کرنے کی صورت میں چونکہ ساہا سال کے تجربات سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے، اور قرآن میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے، کہ دونوں بیویوں کے ساتھ یکساں برتاؤ نہیں ہو سکتا، لہذا یہ طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا ہے۔“

ہمیں سخت حیرت ہے کہ اس آیت میں سے آنا بڑا مضمون کس طرح اور کہاں سے نکل آیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ تو ضرور فرمایا ہے کہ انسان دو یا زائد بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل اگر کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا، مگر کیا اس بنیاد پر اس نے تعدد ازواج کی وہ اجازت واپس لے لی جو عدل کی شرط کے ساتھ اس نے خود ہی سورہ نسا کی آیت نمبر ۳ میں دی تھی؟ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اس فطری حقیقت کو صریح لفظوں میں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ دو یا زائد بیویوں کے شوہر سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک بیوی کی طرف اس طرح ہمت نہ نہ ٹاٹے کہ دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق چھوڑ دے۔ بالفاظ دیگر پورا پورا عدل نہ کر سکنے کا حاصل قرآن کی رو سے یہ نہیں ہے کہ تعدد ازواج کی اجازت ہی سرے سے غسوخ ہو جاتے بلکہ اس کے برعکس اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ شوہر ازواجی تعلق کے لیے ایک بیوی کو مخصوص کر لینے سے پرہیز کرے اور ربط و تعلق سب بیویوں سے رکھے۔

کہ مداخلت کا موقع صرف اس صورت میں دیتا ہے جبکہ ایک شوہر نے اپنی دوسری بیوی۔
 بیویوں کو معلق کر کے رکھ دیا ہو۔ اسی صورت میں وہ بے انصافی واقع ہوگی جس کے ساتھ
 تعددِ ازواج کی اجازت سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ لیکن کسی منطق کی رو سے بھی اس
 آیت کے الفاظ اور اس کی ترکیب اور فحویٰ سے یہ گنجائش نہیں نکالی جاسکتی کہ معلق نہ
 رکھنے کی صورت میں ایک ہی شخص کے لیے تعددِ ازواج کو از روئے قانون ممنوع ٹھہرایا جا
 سکے، کجا کہ اس میں سے اتنا بڑا مضمون نکال لیا جائے کہ ریاست تمام لوگوں کے لیے ایک
 سے زائد بیویاں رکھنے کو مستقل طور پر ممنوع ٹھہرا دے۔ قرآن کی جتنی آیتوں کو بھی آدمی
 چاہے ملا کر پڑھے، لیکن قرآن کے الفاظ میں قرآن ہی کا مفہوم پڑھنا چاہیے، کوئی دوسرا
 مفہوم کہیں سے لا کر قرآن میں پڑھنا اور پھر یہ کہنا کہ یہ مفہوم قرآن سے نکل رہا ہے کسی
 طرح بھی درست طریق مطالعہ بھی نہیں ہے کجا کہ اسے درست طریق اجتہاد مان لیا جائے۔
 آگے بڑھنے سے پہلے ہم فاضل جج کو، اور ان کا سا طرزِ فکر رکھنے والے دوسرے
 حضرات کو بھی، ایک سوال پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ قرآن مجید کی جن آیات پر
 وہ کلام فرما رہے ہیں ان کو نازل ہوتے ۱۳۷۸ سال گزر چکے ہیں۔ اس پوری مدت
 میں مسلم معاشرہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں مسلسل موجود رہا ہے۔ آج کسی ایسی معاشی یا
 تمدنی یا سیاسی حالت کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جو پہلے کسی دور میں بھی مسلم معاشرے کو
 پیش نہ آئی ہو۔ لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ کچھلی صدی کے نصفِ آخر سے پہلے پوری دنیائے
 اسلام میں کبھی یہ تختل پیدا نہ ہوا کہ تعددِ ازواج کو روکنے یا اس پر سخت پابندیاں لگانے
 کی ضرورت ہے؟ کیا اس کی کوئی معقول وجہ اس کے سوا کی جاسکتی ہے کہ اب ہمارے
 ہاں یہ تختل ان مغربی قوموں کے غلبہ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو ایک سے زائد بیوی رکھنے
 کو ایک قبیح و شنیع فعل، اور خارج از نکاح تعلقات کو (بشرط تراضی طرفین) حلال و طیب
 یا کم از کم قابل درگزر سمجھتی ہیں، جن کے ہاں وابستہ رکھنے کا طریقہ قریب قریب مسلم ہو چکا ہے۔

مگر اسی واسطے سے نکاح کر لینا جرم ہے؛ اگر صداقت کے ساتھ فی الواقع اس کے سوا اس تخیل کے پیدا ہونے کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی تو ہم پوچھتے ہیں کہ اس طرح خارجی اثرات سے متاثر ہو کر قرآنی آیات کی تعبیریں کرنا کیا کوئی صحیح طریق اجتہاد ہے؛ اور کیا عام مسلمانوں کے ضمیر کو ایسے اجتہاد پر مطمئن کیا جاسکتا ہے؛

دوسرا اجتہاد، حد سرقہ کے بارے میں | اس کے بعد فاضل جج نے سورہ مائدہ کی آیت ۳۸-۳۹ کو لیا ہے اور اس میں بطور نمونہ یہ اجتہاد کر کے بتایا ہے کہ اس مقام پر قرآن نے چوری کی انتہائی سزا قطعید بتاتی ہے۔ حالانکہ قرآن اس جرم کی انتہائی سزا (MAXIMUM-PUNISHMENT) نہیں بلکہ ایک ہی سزا (ONLY PUNISHMENT) قطعید قرار دے رہا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں :

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا لِّلَّهِ ۚ

چور مرد اور چور عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو ان کے کیے کو قوت کے بدلے میں عبرت ناک سزا کے طور پر اللہ کی طرف سے ۔

اگر قرآن فضول اور بے معنی الفاظ استعمال نہیں کرتا ہے تو اس جملے میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ چور مرد اور چور عورت کے لیے بالفاظ صریح ایک ہی سزا بیان کی گئی ہے، اور وہ ہاتھ کاٹ دینا ہے۔ اس میں انتہائی سزا کا تصور کس راستے سے داخل ہو سکتا ہے؛

تیسرا اجتہاد، حضانت کے مسئلے میں | آخری نمونہ اجتہاد فاضل جج نے ایسے بچوں کی حضانت کے مسئلے میں کر کے بتلایا ہے جن کی مائیں اپنے شوہروں سے جدا ہو چکی ہوں۔ اس معاملہ وہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۳ اور سورہ طلاق کی آیت ۶ نقل کر کے حسب ذیل دو باتیں ارشاد فرماتے ہیں اور دونوں قرآنی الفاظ کے حدود سے صریحاً خارج ہیں :

پہلی بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ ان آیات کی رو سے ماؤں کو پورے دو سال اپنے بچوں کو دودھ پلانا ہوگا۔ حالانکہ جج نے کہا کہ ان کی رو سے پورے دو سال

تو درکنار، بجائے خود دودھ پلانا بھی لازم نہیں کیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت میں فرمایا گیا ہے
 وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ۔ اور میں
 اپنے بچوں کو دودھ پلائیں پورے دو سال اُس شخص کے لیے جو رضاعت پوری کرنا چاہتا
 ہو۔ اور سورہ طلاق والی آیت میں فرمایا گیا ہے فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَارْضَعْنَ أَجُورَهُنَّ
 پھر اگر وہ تمہارے لیے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انہیں دو۔“

دوسری بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ ”قرآن میں ایسی کوئی ہدایت نہیں ہے کہ ایک عورت
 اگر طلاق پا کر دوسری شادی کرے تو پہلا شوہر اس سے اپنا بچہ لے سکتا ہے“ اگر محض اس
 بنا پر کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے وہ بچہ سے محروم ہو سکتی ہے تو میں کوئی وجہ نہیں سمجھتا
 کہ ایک مرد دوسری شادی کر لینے کی صورت میں کیوں نہ اپنے بچہ سے محروم ہو۔ یہ بات ارشاد
 فرماتے وقت فاضل حج کو غالباً یہ خیال نہ رہا کہ چند سطر اوپر جو آیات انہوں نے خود نقل کی
 ہیں ان میں بچے کو باپ کا قرار دیا گیا ہے اور اول سے لیکر آخر تک ان میں سارے کام
 اسی بنیاد پر دیتے گئے ہیں کہ بچہ باپ کا ہے۔ عَلَى الْمَوْلودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ۔ جس
 کا بچہ ہے اس کے ذمہ دودھ پلانے والی ماں کے کھانے کپڑے کا خرچ ہے۔ وَإِنْ
 أَرَدْتُمْ أَنْ تُنْزِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔ اور اگر تم کسی دوسری عورت سے
 اپنے بچے کو دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ
 فَارْضَعْنَ أَجُورَهُنَّ۔ پھر اگر وہ تمہارے لیے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کی اجرت ان کو
 دو۔ بانی کورٹ کے ایک فاضل حج سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ قرآن کے یہ الفاظ
 بچے کے معاملہ میں باپ اور ماں کی پوزیشن کے درمیان کیا فرق ظاہر کر رہے ہیں۔

بنیادی غلطی | ان تینوں مسائل میں فاضل حج نے اس انداز میں بحث کی ہے کہ گویا تو بنیاد
 میں غم کرتا ہوا سیدھا ہمارے پاس پہنچ گیا ہے مسلم معاشرے کا کوئی ماضی نہیں ہے جس میں
 اس کتاب کے احکام سمجھنے سمجھانے اور اس پر عمل کرنے کا کوئی کام کبھی ہوا ہو اور جس سے

ہمیں کسی قسم کے کوئی نظائر کہیں ملتے ہوں۔ کوئی نبی نہ تھا جس پر یہ قرآن اترا ہو اور اس نے اس کے کسی حکم کا مطلب بیان کیا ہو یا اس پر عمل کر کے بتایا ہو۔ کوئی خلفاء، کوئی صحابہ، کوئی تابعین، کوئی فقہاء، کوئی قاضی اور حکام عدالت اس امت میں نہیں گزرے ہیں ہمیں پہلی مرتبہ ہی ان مسائل سے سابقہ پیش آگیا ہے کہ یہ قرآن جو تعددِ ازدواج کی اجازت دیتا ہے، یا چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر کرتا ہے، یا بچوں کی حضانت کے متعلق کچھ ہدایات دیتا ہے ان پر ہم کیا قواعد و ضوابط بنائیں۔ اس طرح کے تمام معاملات میں تیرہ چودہ برس کا اسلامی معاشرہ ہمارے لیے گویا معدوم محض ہے۔ سب کچھ ہمیں قرآن ہاتھ میں لیکر نئے سرے سے کرنا ہے، اور وہ بھی اُس طرح جس کے چند نمونے اوپر ہم سے سامنے آئے ہیں۔

سُنّت کے متعلق فاضل حج کا نقطہ نظر | یہ اندازِ بحث محض اتفاقی نہیں ہے بلکہ پیراگراف ۲۱ سے جو بحث شروع ہوتی ہے اس کو پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ فاضل حج کی سوچی سمجھی رائے کا نتیجہ ہے۔ یہ چونکہ ان کے فیصلے کا اہم ترین حصہ ہے اس لیے ہم اس کے ایک ایک نکتے کو نمبر وار نقل کر کے ساتھ ساتھ اس پر تنقید کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ ہر نکتے کی بحث صاف ہوتی چلی جائے۔

سُنّت کے بارے میں امت کا رویہ | وہ فرماتے ہیں کہ :-

”قرآن کے علاوہ حدیث یا سنت کو بھی مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد

نے اسلامی قانون کا ایک اتنا ہی اہم ماخذ سمجھ لیا ہے“ (پیراگراف ۲۱)

کوئی شخص جس نے اسلامی قانون اور اس کی تاریخ کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہو یہ ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس فقرے میں صحیح صورتِ واقعہ بیان کی گئی ہے۔ صحیح صورتِ واقعہ یہ ہے کہ عہدِ رسالت سے لیکر آج تک پوری امت، تمام دنیائے اسلام میں سنتِ رسول کو قرآن کے بعد قانون کا بنیادی ماخذ، اور حدیث کو سنت کے معلوم کرنے کا ذریعہ مانتی چلی آرہی ہے۔ آج بھی مان رہی ہے۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کے مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں، تاریخِ اسلام میں پہلی مرتبہ

ایک مختصر ساگر وہ دوسری صدی ہجری میں ظاہر ہوا تھا جس نے اس کا انکار کیا تھا، اور اس کی تعداد مسلمانوں میں بڑے مبالغہ کے ساتھ بھی بیان کی جاتے تو دس ہزار میں ایک سے زیادہ نہ تھی۔ تیسری صدی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے یہ گروہ ناپید ہو گیا، کیونکہ سنت کے ماخذ قانون ہونے کے حق میں ایسے مضبوط علمی دلائل و شواہد موجود تھے کہ اس گمراہانہ خیال کا زیادہ دیر تک پھیرنا ممکن نہ تھا۔ پھر ۹ صدیوں تک دنیا سے اسلام اس طرح کے کسی گروہ کے وجود سے بالکل خالی رہی، حتیٰ کہ اسلامی تاریخ میں کسی ایک شخص کا ذکر بھی نہیں ملتا جس نے یہ خیال ظاہر کیا ہو۔ اب اس طرز خیال کے لوگ از سر نو پچھلی صدی سے ظاہر ہونے شروع ہوئے ہیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے کہ ایسے افراد کے پیرو دنیا سے اسلام میں کتنے ہیں، تو ان کا اوسط ایک لاکھ میں ایک سے زیادہ نہ نکلے گا۔ کیا اس امر واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرنا کہ ”مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے سنت کو ماخذ قانون سمجھ لیا ہے“ حقیقت کی صحیح ترجمانی ہے؟ اس کے بجائے یہ کہنا صحیح تر ہو گا کہ ”مسلمانوں کی ایک بالکل ناقابل لحاظ تعداد سنت کے ماخذ قانون ہونے سے انکار کرنے لگی ہے“

فاضل حج کے نزدیک دین میں نبی کی حیثیت | اس کے بعد فاضل حج نے یہ سوال اٹھا: ہے کہ دین میں نبی کی حیثیت کیا ہے۔ اس سوال پر بحث کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

وہ اسلامی قانون کا ماخذ ہونے کی حیثیت سے حدیث کی قدر و قیمت کیا ہے، اس کو

پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اسلامی دنیا میں رسول پاک کا مرتبہ و مقام کیا ہے۔ میں اس فیصلہ کے ابتدائی حصہ میں یہ بتا چکا ہوں کہ اسلام ایک خدائی دین ہے۔ یہ اپنی سند خدا سے، اور صرف خدا ہی سے مینا ہے۔ اگر یہ اسلام کا صحیح تصور ہے تو اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد رسول اللہ کے اقوال و افعال، اور کردار کو خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کی سی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ زیادہ سے زیادہ ان سے یہ معلوم کرنے میں مدد ملی جاسکتی ہے کہ مخصوص حالات میں قرآن کی تعبیر کس طرح کی گئی تھی

یا ایک خاص معاملہ میں قرآن کے عام اصولوں کو واقعات پر کس طرح منطبق کیا گیا تھا کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ محمد رسول اللہ ایک کامل انسان تھے۔ نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ جس عزت اور تکریم کے مستحق ہیں یا جس عزت و تکریم کا ہم ان کیسے اظہار کرنا چاہتے ہیں، اس کے اظہار کی قوت و قابلیت وہ رکھتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ وہ خدا نہ تھے، نہ خدا سمجھے جاسکتے ہیں۔ دوسرے تمام رسولوں کی طرح وہ بھی انسان ہی ہیں۔ (پیراگراف ۲۱)

”وہ ہماری طرح خانی تھے۔۔۔ وہ ایک نذیر تھے مگر یقیناً خدا نہ تھے۔۔۔ ان کو بھی اسی طرح خدا کے احکام کی پیروی کرنی پڑتی تھی جس طرح ہمیں، بلکہ شاید قرآن کی رو سے ان کی ذمہ داریاں اور مسئولیتیں ہماری بہ نسبت بہت زیادہ تھیں۔ وہ مسلمانوں کو اُس سے زیادہ کوئی چیز نہ دے سکتے تھے جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان کو دی گئی تھی۔“ (پیراگراف ۲۱)

ان باتوں کے حق میں قرآن مجید کی چند آیات استدلال کرنے کے بعد وہ پھر فرماتے ہیں:-
 ”محمد رسول اللہ اگرچہ بڑے عالی مرتبہ انسان تھے، مگر ان کو خدا کے بعد دوسرا درجہ ہی دیا جاسکتا ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے، ماسوا اس وحی کے جو ان کے پاس خدا کی طرف سے آئی تھی، وہ خود اپنے بھی کچھ خیالات رکھتے تھے اور اپنے ان خیالات کے زیر اثر وہ کام کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ محمد رسول اللہ نے کوئی گناہ نہیں کیا، مگر وہ غلطیاں تو کر سکتے تھے اور یہ حقیقت خود قرآن میں تسلیم کی گئی ہے، لِيُغْفَرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ....“

”ایک سے زیادہ مقامات پر قرآن میں یہ بیان ہوا ہے کہ محمد رسول اللہ دنیا کے لیے ایک بہت اچھا نمونہ ہیں، مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک آدمی کو دنیا ہی ایسا نہ رہے، دنیا ہی راستبازہ و سچا ہی سرگرم اور دنیا ہی دیندار اور متقی ہونا

چاہیے جیسے وہ تھے، نہ یہ کہ ہم بھی بعینہ اسی طرح سوچیں اور عمل کریں جس طرح وہ سوچتے اور عمل کرتے تھے، کیونکہ یہ تو غیر فطری بات ہوگی اور ایسا کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اور اگر ہم ایسا کرنے کی کوشش کریں تو زندگی بالکل ہی مشکل ہو جائے گی۔ (پیرا گراف ۲۲)

”یہ سب صحیح ہے کہ قرآن پاک اس کی تاکید کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ کی اطاعت

کی جائے۔ مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جہاں انہوں نے ہم کو ایک خاص کام ایک خاص طرح کرنے کا حکم دیا ہے، ہم وہ کام اسی طرح کریں۔ اطاعت تو ایک حکم ہی کی ہو سکتی ہے۔ جہاں کوئی حکم نہ ہو وہاں نہ اطاعت ہو سکتی ہے نہ عدم اطاعت۔ قرآن کے ان ارشادات سے یہ مطلب اخذ کرنا بہت مشکل ہے کہ ہم ٹھیک وہی کچھ کریں جو رسول نے کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک فرد واحد کے زمانہ حیات کا تجربہ واقعات کی ایک محدود تعداد سے زیادہ کے لیے نظائر فراہم نہیں کر سکتا، اگرچہ وہ فرد واحد نبی ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ بات پورے زور کے ساتھ کہی جانی چاہیے کہ اسلام نے نبی کو کبھی خدا نہیں سمجھا ہے۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ قرآن اور حدیث میں جو ہری اور حقیقی فرق ہے۔ (پیرا گراف ۲۳)

نبی کی اصل حیثیت از روئے قرآن | ہم بڑے ادب کے ساتھ عرض کریں گے کہ درحقیقت ان تمام عبارتوں میں غلط بحث زیادہ اور اصل مسئلہ زیر بحث سے تعرض بہت کم ہے۔ اصل مسئلہ جس کی تحقیق اس مقام پر مطلوب تھی وہ یہ نہیں تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ خدا ہیں یا نہیں، اور وہ انسان ہیں یا کچھ اور، اور دین کے احکام میں سند و مرجع خدا کا حکم ہے یا کسی اور کا۔ بلکہ تحقیق جس چیز کی کرنی چاہیے تھی وہ یہ تھی کہ رسول پاک کو اللہ تعالیٰ نے کس کام کے لیے مقرر کیا ہے، دین میں ان کی حیثیت اور اختیارات کیا ہیں، اور خدا کے احکام آیا صرف وہی ہیں جو قرآن کی آیات میں بیان ہوئے ہیں یا وہ بھی ہیں جو رسول پاک نے قرآن کے علاوہ ہم کو دیئے۔ ان سوالات کی تحقیق ان آیات سے نہیں ہو سکتی جنہیں فاضل

خج نے نقل کیا ہے، کیونکہ اُن میں سرے سے ان سوالات کا جواب دیا ہی نہیں گیا۔
ان کا جواب تو حسبِ ذیل آیات سے ملتا ہے جن کی طرف ماحصلِ حج نے سرے سے
توجہ ہی نہیں کی :

اللہ نے احسان کیا مومنوں پر جبکہ بھیجا ان کے
درمیان خود انہی میں سے ایک رسول جو
تلاوت کرتا ہے ان پر اس کی آیات اور
ترکیہ کرتا ہے اُن کا، اور تعلیم دیتا ہے اُن کو
کتاب کی اور دانائی کی۔

۱۔ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ
إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَ
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

(آل عمران - ۱۶۴)

اور ہم نے یہ ذکر یعنی قرآن، نازل کیا ہے
تیری طرف تاکہ تو تشریح کرے لوگوں کے لیے
اُس و کتاب کی جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔
روہ نبی، حکم دیتا ہے ان کو نیکی کا اور منع کرتا
ہے ان کو برائی سے اور حلال کرتا ہے ان
کے لیے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان
کے لیے ناپاک چیزیں۔

۲۔ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ الْبَيِّنَ
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔

(المحل - ۴۴)

۳۔ يَا مَعْرُوفُ بِالْمَعْرُوفِ وَ
يَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُجِشُّ لَهُمْ
الطَّيِّبَاتِ وَ يَحْرِمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ

(الاعراف - ۱۵۷)

۴۔ وَمَا أَسْكُمُ الرَّسُولُ فَخْذُوهُ
وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر - ۷)

۵۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ
إِلَّا بِطَاعَةِ إِذْنِ اللَّهِ وَالنَّاسِ (۶)

۶۔ وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ
أَطَاعَ اللَّهَ۔

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس
چیز سے روک دے اس سے رک جاؤ۔
اور ہم نے کوئی رسول بھی نہیں بھیجا مگر اس لیے
کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔
جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ

اور اگر تم رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔

۷۔ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا

(النور - ۵۴)

تمہارے لیے رسول کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

۸۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ

أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب - ۲۱)

پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہونگے جب تک تجھے اُس معاملہ میں نصیہ کرنے والا نہ مان لیں جس میں ان کے درمیان اختلاف ہے، پھر جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں اور اسے سرسبر تسلیم کر لیں۔

۹۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ

يُحْكَمُوا فِي مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا

يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا

قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

(النساء - ۶۵)

اُسے لوگو جو ایمان لاتے ہو اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو پھر دو اس کو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روز آخرت پر۔ اُسے بنی، ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت رکھے گا۔

۱۰۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا

اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ

مِنْكُمْ فَإِنْ نَسَا زَعَمْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ

إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ

تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔

(النساء - ۵۹)

۱۱۔ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ

فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ

وَأَلْ عَمْرَأَن ۱۳۱

ان گیارہ آیات کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو دین اسلام میں رسول پاک کی حقیقی حیثیت

بالکل قطعی اور واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ بلاشبہ وہ خدا تو نہیں ہیں، انسان ہی

ہیں۔ مگر وہ ایسے انسان ہیں جن کو خدا نے اپنا نمائندہ مجاز بنا کر بھیجا ہے۔ خدا کے احکام براہِ راست ہمارے پاس نہیں آتے بلکہ ان کے واسطے سے آتے ہیں۔ وہ محض اس لیے مقرر نہیں کیے گئے ہیں کہ خدا کی کتاب کی آیات جو ان پر نازل ہوں، بس وہ پڑھ کر ہمیں سنا دیں، بلکہ ان کے تقرر کا مقصد یہ ہے کہ وہ کتاب کی تشریح کریں، ایک مرتبی کی حیثیت سے ہمارے افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں، اور ہمیں کتاب اللہ کی اور داناتی کی تعلیم دیں۔ آیت نمبر ۳ تصریح کرتی ہے کہ اُن کو تشریعی اختیارات (LEGISLATIVE POWERS) بھی اللہ تعالیٰ نے تفویض کیے ہیں۔ اور اس میں کوئی قید ان کے اختیارات کو صرف قرآنی احکام کی تشریح تک محدود کرنے والی نہیں ہے۔ آیت نمبر ۴ علی الاطلاق یہ حکم دیتی ہے کہ جو کچھ وہ دیں اسے لے لو اور جس چیز سے بھی روک دیں اس سے یک جاؤ۔ اس میں بھی کوئی قید ایسی نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ جو کچھ وہ آیات قرآنی کی شکل میں دیں صرف اسی کو لو۔ آیت نمبر ۵ ان کی سیرت و کردار اور اُن کے عمل کو ہمارے لیے نمونہ قرار دیتی ہے۔ اس مقام پر یہ شرط نہیں لگائی گئی ہے کہ اپنے جس قول اور عمل کی سند وہ قرآن سے دے دیں صرف اسی کو اپنے لیے نمونہ سمجھو بلکہ اس کے برعکس مطلقاً ان کو معیارِ حق کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ آیات نمبر ۶ اور ۷ ہمیں ان کی اطاعت کا حکم دیتی ہیں اور یہاں بھی قطعاً کوئی اشارہ اس امر کی طرف نہیں ہے کہ یہ اطاعت صرف اُن احکام کی حد تک ہے جو آیات قرآنی کی شکل میں وہ دیں۔ آیت نمبر ۸ ان کو ایک ایسا حج بناتی ہے جس کی طہارت فیصلے کے لیے رجوع کرنا اور جس کا فیصلہ بظاہر ہی نہیں بلکہ راہِ سے ماننا شرطِ ایمان ہے۔ یہ وہ حیثیت ہے جو دنیا کی کسی عدالت اور کسی حج کو بھی حاصل نہیں ہے۔ آیت نمبر ۹ ان کی حیثیت کو مسلمانوں کے تمام لئے تزکیہ کے حقیقی برائیوں سے پاک کرنا اور بھلائیوں کو نشوونما دینا ہے۔ اس لئے ہمیں آپ کے یہ معنی بھی متفق ہیں کہ تزکیہ کرنے والا ہی اُن برائیوں کو شتم کر چکا ہے جس سے افراد اور معاشرے کو پاک کرنا ہے، اور اُن بھلائیوں کا تعین کر چکا ہے جو نشوونما دینا ہے۔

دوسرے اولی الامر کی حیثیت سے الگ کر دیتی ہے۔ اولی الامر دین میں صدر ریاست، اس کے وزراء، اس کے اہل شوریٰ، اس کی حکومت کے جملہ تنظیمیں، اور عدلیہ کے حکام، سب شامل ہیں، اطاعت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر آتے ہیں، اور اللہ کی اطاعت پہلے نمبر پر ہے۔ ان دونوں کے درمیان رسول کا مقام ہے۔ اور اس مقام پر رسول کی حیثیت یہ ہے کہ اولی الامر سے تو مسلمانوں کی نزاع ہو سکتی ہے مگر رسول سے نہیں ہو سکتی، بلکہ ہر نزاع جو پیدا ہو اس میں فیصلے کے لیے رجوع اللہ اور اس کے رسول کی طرف کیا جائے گا۔ اس پوزیشن کو تسلیم کرنا بھی شرط ایمان قرار دیا گیا ہے جیسا کہ آیت کے آخری الفاظ ان کنتم قوم منون باللہ والیوم الآخر سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ پھر آخری آیت اللہ کی محبت کا ایک ہی تقاضا، اور اس کی محبت حاصل ہونے کا ایک ہی راستہ بتاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کے رسول کا اتباع کرے۔

یہ ہے دین اسلام میں رسول کی اصل حیثیت جسے قرآن اتنی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ کیا اس کو ملاحظہ فرمانے کے بعد فاضل حج اپنی اس رائے پر نظر ثانی فرمائیں گے جو انہوں نے پیرا گراف نمبر ۲ میں بیان کی ہے؟ کیا دونوں تصویروں کو بالمقابل رکھ کر یہ صاف نظر نہیں آتا کہ انہوں نے رسول پاک کی حیثیت کا تخمینہ حضور کی اصل حیثیت سے بہت کم بلکہ بنیادی طور پر مختلف لگا یا ہے؟

کیا وحی صرف قرآن تک محدود ہے؟ فاضل حج کا یہ ارشاد غلط بالکل صحیح ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو اس سے زیادہ کوئی چیز نہ دے سکتے تھے جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان کو دی گئی تھی۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور یہ سوال اتنا اہم ہے کہ اس مخزن کے نزدیک حضور پر آیا صرف وہی وحی آتی تھی جو قرآن میں درج ہے، یا اس کے علاوہ بھی آپ کو وحی کے ذریعہ سے ہدایات ملتی تھیں۔ اگر پہلی بات ہے تو اس کی صورت قابل تسلیم نہیں ہے۔ قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ نبی پر کتاب اللہ کی آیات کے سوا اور کوئی وحی نہیں آتی، بلکہ اس کے برعکس اس سے کتاب کے علاوہ بھی نبی کو خدا

کی طرف سے ہدایات ملتی ہیں۔ اور اگر دوسری بات ہے تو قرآن کے ساتھ سنت کو بھی ماخذِ قانون ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے، کیونکہ وہ بھی اسی خدا کی طرف سے ہے جس کی طرف سے قرآن نازل ہوا ہے

کیا حضور اپنے خیالات کی پٹری کے لیے آزاد تھے؟ | پھر فاضل موصوف کا یہ ارشاد شدت کے ساتھ نظر ثانی کا محتاج ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماسواً اس وحی کے جو ان کے پاس خدا کی طرف سے آئی تھی، خود اپنے بھی کچھ خیالات رکھتے تھے اور ان خیالات کے زیر اثر کام کرتے تھے۔ یہ بات نہ قرآن سے مطابقت رکھتی ہے اور نہ عقل اس کو باور کر سکتی ہے۔ قرآن مجید بار بار اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت سے جو فرائض حضور پر عائد کیے گئے تھے اور جو خدمات آپ کے سپرد کی گئی تھیں، ان کی انجام دہی میں آپ اپنے ذاتی خیالات و خواہشات کے مطابق کام کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیئے گئے تھے، بلکہ آپ وحی کی رہنمائی کے پسند تھے۔

إِنْ أَتَّبِعْ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (الانعام - ۵۰)۔ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ رَبِّي (الاعراف: ۲۰۳)۔ مَا مَلَّكَ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم: ۲-۳-۴)۔

رہی عقل، تو وہ کسی طرح یہ نہیں مان سکتی کہ ایک شخص کو خدا کی طرف سے رسول بھی مقرر کیا جائے اور پھر اسے رسالت کا کام اپنی خواہشات و رجحانات اور ذاتی اراد کے مطابق انجام دینے کے لیے آزاد بھی چھوڑ دیا جائے۔ ایک معمولی حکومت بھی اگر کسی شخص کو کسی علاقے میں اُسرنے یا گورنر یا کسی ملک میں اپنا سفیر مقرر کرتی ہے تو وہ اُسے اپنی سرکاری ڈیوٹی انجام دینے میں خود اپنی مرضی سے کوئی پالیسی بنائینے اور اپنے ذاتی خیالات کی بنا پر بولنے اور کام کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیتی۔ اتنی بڑی ذمہ داری کا منصب دینے کے بعد اس کو سختی کے ساتھ حکومت بالادست کی پالیسی اور اس کی ہدایات کا پابند کیا جاتا ہے۔ اس کی سخت نگرانی رکھی جاتی ہے کہ وہ کوئی کام سرکاری پالیسی اور ہدایات کے خلاف نہ کرنے پائے۔ جو معاملات اس کی صوابدید پر چھوڑے جاتے ہیں ان میں بھی گہری نگرانی کی جاتی ہے کہ وہ اپنی صوابدید کو ٹھیک

استعمال کر رہا ہے یا غلط۔ اس کو صرف وہی ہدایات نہیں دی جاتیں جو پبلک میں پیش کرتے کے لیے یا جس قوم کی طرف وہ سفیر بنایا گیا ہے اسے سنانے کے لیے ہوں بلکہ اسے خفیہ ہدایات بھی دی جاتی ہیں جو اس کی اپنی رہنمائی کے لیے ہوں۔ اگر وہ کوئی بات حکومتِ بلا لاؤسٹ کے منشا کے خلاف کر دے تو اس کی فوراً اصلاح کی جاتی ہے یا اسے واپس بلا لیا جاتا ہے۔ دنیا اس کے اقوال و افعال کے لیے اس حکومت کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے جس کی وہ نمائندگی کر رہا ہے، اور اس کے قول و فعل کے متعلق لازماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسے اس کی مقرر کرنے والی حکومت کی منظوری حاصل ہے، یا کم از کم یہ کہ حکومت اس کو ناپسند نہیں کرتی۔ حد یہ ہے کہ اس کی پرائیویٹ زندگی تک کی برائی اور بھلائی اس حکومت کی نام وری پر اثر انداز ہوتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہے۔ اب کیا خدا ہی سے اس بے احتیاطی کی امید کی جاتے کہ وہ ایک شخص کو اپنا رسول مقرر کرتا ہے، دنیا بھر کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، اسے اپنی طرف سے نمونے کا آدمی ٹھہراتا ہے، اس کی بے چون و چرا اطاعت اور اس کے اتباع کا بار بار تباکیدِ علم دیتا ہے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیتا ہے کہ اپنے ذاتی خیالات کے مطابق جس طرح چاہے رسالت کی خدمات انجام دے؟

حضور کی سنتِ غلطیوں سے پاک ہے یا نہیں؟ | فاضل حج فرماتے ہیں: ”یہ صحیح ہے کہ محمد رسول اللہ نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر وہ غلطیاں کر سکتے تھے اور یہ حقیقت خود قرآن میں تسلیم کی گئی ہے۔“ اس کے متعلق اگر قرآن کا تتبع کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف پانچ مواقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غلطی پر تنبیہ فرمائی ہے۔ ایک سورہ انفال آیت ۶۷-۶۸ میں۔ دوسرے سورہ توبہ آیت ۹ میں تیسرے سورہ احزاب آیت ۳۷ میں۔ چوتھے سورہ تحریم آیت ۱۱ میں۔ پانچویں سورہ عبس آیت ۱-۱۰ میں۔ چھٹا مقام جہاں گمان کیا جاسکتا ہے کہ شاید یہاں کسی غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے وہ سورہ توبہ آیت ۸۴ ہے۔ پورے ۲۳ سال کے زمانہ نبوت میں ان پانچ یا چھ مواقع کے سوا قرآن مجید میں نہ حضور کی کسی غلطی کا ذکر آیا ہے، نہ

اس کی اصلاح کا۔ اس سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس پورے زمانے میں حضورؐ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں فرائضِ نبوت انجام دیتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر نگاہ رکھتا رہا ہے کہ اس کا نمائندہ مجاز کہیں اس کی غلط نمائندگی اور لوگوں کی غلط رہنمائی نہ کرنے پائے، اور ان پانچ یا چھ مواقع پر حضورؐ سے جو ذرا سی چوک ہو گئی ہے اس پر فوراً ٹوک کر اس کی اصلاح کر دی گئی ہے۔ اگر ان چند مواقع کے سوا کوئی اور غلطی آپؐ ہو جاتی تو اس کی بھی اسی طرح اصلاح کر دی جاتی جس طرح ان غلطیوں کی کر دی گئی ہے۔ لہذا یہ چیز حضورؐ کی رہنمائی پر سے ہمارا اطمینان رخصت کر دینے کے بجائے اس کو اور زیادہ مضبوط کر دینے والی ہے۔ ہم اب یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضورؐ کی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی کا پورا کارنامہ خطا اور انحراف سے بالکل پاک ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا (APPROVAL) حاصل ہے۔

اتباع رسول کا حقیقی مفہوم | حضورؐ کے اتباع کا جو حکم قرآن میں دیا گیا ہے اس کو فاضل

حج اس معنی میں لیتے ہیں کہ ”ہم بھی ویسے ہی ایماندار اور راستباز اور ویسے ہی سرگرم اور دیندار و متقی بنیں جیسے حضورؐ تھے۔“ اُن کے نزدیک اتباع کا یہ مفہوم ”غیر فطری اور ناقابلِ عمل ہے کہ ہم بھی اُسی طرح سوچیں اور عمل کریں جس طرح حضورؐ سوچتے اور عمل کرتے تھے۔“ وہ فرماتے ہیں کہ یہ مفہوم اگر لیا جائے تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ اس کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ اتنے بڑے نبیادی مسئلے کو بہت ہی سطحی انداز میں لے لیا گیا ہے۔ اتباع کے معنی محض صفات میں ہم رنگ ہونے کے نہیں ہیں، بلکہ طرزِ فکر، معیارِ اقدار، اصول و نظریات، اخلاق و معاملات اور سیرت و کردار میں پیروی کرنا بھی لازماً اس میں شامل ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ جہاں حضورؐ نے اُستاد کی حیثیت سے دین کے کسی حکم پر عمل کر کے بتایا ہو وہاں شاگرد کی طرح اس عمل میں آپؐ کی پیروی کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جس تراش خراش کا لباس آپؐ پہنتے تھے وہی ہم پہنیں، جس طرز کے کھانے آپؐ کھاتے تھے وہی ہم کھائیں، جس قسم کی سواریاں آپؐ استعمال فرماتے تھے انہی ہم بھی، یا جن اسلحہ سے آپؐ

جنگ کرتے تھے ان کے سوا ہم کوئی ہتھیار استعمال نہ کریں۔ اتباع کا یہ مفہوم اگر دیا جائے تو بے شک زندگی اجیرن ہو جائے، مگر امت میں آج تک کوئی ذمی علم آدمی ایسا نہیں گزرا ہے جو اس معنی میں اتباع کے وجوب کا قائل ہو۔ اس کا مطلب ابتدا سے تمام مسلمانوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضور نے اپنے قول و عمل سے اسلامی انداز فکر اور دین کے اصول و احکام کی جو تشریح فرمائی ہے اُس میں ہم آپ کی پیروی کریں۔

مثال کے طور پر اسی تعدد ازواج کے مسئلے کو لے لیجیے جس پر فاضل حج نے اس سے پہلے شرح و بسط کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ اس میں حضور کے قول و فعل سے قطعی طور پر یہ انداز فکر ظاہر ہوتا ہے کہ تعدد ازواج فی الاصل کوئی برائی نہیں ہے جس پر پابندی عائد کرنے کی ضرورت ہو اور یک زوجی درحقیقت کوئی قدر مطلوب نہیں ہے جسے معیار کے طور پر نگاہ میں رکھ کر قانون سازی کی جائے۔ لہذا حضور کے اتباع کا تقاضا یہ ہے کہ یہی اس مسئلے میں ہمارا طرز فکر بھئی۔ پھر اس سلسلے میں قرآن کی ہدایات پر حضور کی اپنی حکومت میں جس طرح عمل کیا گیا وہ ان ہدایات کی صحیح ترین تشریح ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی چاہیے۔ آپ کے زمانہ میں لوگوں کے معاشی حالات ہمارے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب تھے۔ مگر آپ نے کبھی اشارۃً بھی ان وجوہ سے تعدد ازواج پر پابندی نہیں لگائی۔ آپ نے کسی شخص سے جو دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہو یہ نہیں فرمایا کہ پہلے ثابت کر دو کہ تم کو فی الواقع اس کی ضرورت ہے اور تم دو یا نو اند بیویوں کا بار بھی اٹھا سکتے ہو۔ آپ نے کسی سے نہیں پوچھا کہ کس تنیم بچے کی پرورش کے لیے تم دوسرا نکاح کرنا چاہتے ہو۔ آپ نے کسی سے نہیں کہا کہ پہلے اپنی پہلی بیوی کو راضی کرو۔ آپ کی حکومت میں یہ بات بالکل کھلے طور پر جائز تھی کہ ایک شخص اپنی مرضی کے مطابق چار تک ختنی چاہے شادیاں کرے۔ مداخلت آپ کے زمانے میں اگر کبھی ہوتی ہے تو صرف اُس وقت جبکہ کسی نے بیویوں کے درمیان انصاف نہیں کیا ہے۔ اب اگر ہم رسول پاکؐ کے تتبع میں تو ہمارا کام یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ تمہیں ایک نیا اختیار دینے میں بیٹھ جائیں، بلکہ ہمیں لازماً یہ

بھی دلیہنا چاہیے کہ جس رسول پر یہ آئینیں نازل ہوئی تھیں اس نے ان کا منشا کیا سمجھا تھا اور اسے کس طرح عمل کا جامہ پہنایا تھا۔

کیا حضورؐ کی رہنمائی صرف اپنے زمانے کے لیے تھی؟ | فاعمل حج کا ارشاد ہے کہ زیادہ سے زیادہ جو فائدہ حضورؐ کے اقوال و افعال اور کردار سے اٹھایا جاسکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان سے ”یہ معلوم کرنے میں مدد ملی جاسکتی ہے کہ مخصوص حالات میں قرآن کی تعبیر کس طرح کی گئی تھی، یا ایک خاص معاملہ میں قرآن کے عام اصولوں کو کس طرح منطبق کیا گیا تھا“ یہ ارشاد پڑھنے والے کو یہ تاثر دیتا ہے کہ موصوف کے نزدیک حضورؐ کی رہنمائی دنیا بھر کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نہیں تھی بلکہ اپنے زمانے کی ایک مخصوص سوسائٹی کے لیے تھی یہی تاثر ان کے یہ الفاظ بھی دیتے ہیں کہ ”ایک فرد واحد کے زمانہ حیات کا تجربہ واقعات کی ایک محدود تعداد سے زیادہ کے لیے نظائر فراہم نہیں کر سکتا“ اس مسئلے پر چونکہ انہوں نے اپنا نقطہ نظر پوری طرح واضح نہیں کیا ہے اس لیے اس پر مفصل بحث تو نہیں کی جاسکتی، لیکن مجھلا جو تاثر ان کے یہ الفاظ دے رہے ہیں اس کے بارے میں چند کھمات عرض کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید اس بات پر شاہد ہے کہ جس طرح وہ خود ایک خاص زمانے میں ایک خاص قوم کو خطاب کرنے کے باوجود ایک عالمگیر اور دائمی ہدایت ہے، اسی طرح اس کا لانے والا رسول بھی ایک معاشرے کے اندر چند سال تک فرائض رسالت انجام دینے کے باوجود تمام انسانوں کے لیے اب تک ہادی و رہنما ہے۔ جس طرح قرآن کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے :

وَأَوْحَىٰ إِلَىٰ هَٰذَا الْقُرْآنِ لِتُذَكَّرَ
بِهِ وَمَنْ يَدْعُ - (الانعام - آیت ۱۱۹)

اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے متنبہ کروں تم کو

ٹھیک اسی طرح قرآن کے لانے والے رسول کے متعلق بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ :

اے محمدؐ کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ

اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف - ۱۵۸)

سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

اور اے محمدؐ، نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر تمام

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ

انسانوں کی طرف بشارت دینے والا اور

كَثِيرًا وَنَذِيرًا (سبا - ۲۸)

متنبہ کرنے والا بنا کر۔

محمدؐ تو ہمارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ

ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں

وَأَكْبَرُ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ -

کے خاتم ہیں۔

(الاحزاب - ۴۱)

اس لحاظ سے قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اگر وقتی اور محدود ہیں تو دونوں ہیں، اگر دائمی اور عالمگیر ہیں تو دونوں ہیں۔ آخر کون نہیں

جانتا کہ قرآن کا نزول سلسلہ میں شروع ہوا تھا اور سلسلہ میں اس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آخر

کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ اس قرآن کے مخاطب اُس زمانے کے اہل عرب تھے

اور انہی کے حالات کو سامنے رکھ کر اس میں ہدایات دی گئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر کس

بنا پر ہم ان ہدایات کو ہمیشہ کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے رہنمائی کا سرچشمہ مانتے

ہیں؟ جو جواب اس سوال کا ہے، بعینہ وہی جواب اس سوال کا بھی ہے کہ ایک فرد

وامحمد کی پیغمبرانہ زندگی جو ساتویں صدی عیسوی میں صرف ۲۲ شمسی سالوں تک بسر ہوئی تھی

اس کا تجربہ تمام زمانوں اور تمام انسانوں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہے۔

یہاں اس تفصیل کا موقع نہیں ہے کہ ہدایت کے یہ دونوں ذریعے زمان و مکان سے

محدود ہونے سے باوجود کس کس طرح ابدی اور عالمگیر رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ ہم یہاں صرف

یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جو لوگ قرآن کی عالمگیری اور ہدایت کے قائل ہیں وہ خدا کی

کتاب اور خدا کے رسول کے درمیان فرق کس بنیاد پر کرتے ہیں؟ آخر کس دلیل سے ایک کی رہنمائی عام ہے اور دوسرے کی رہنمائی محدود و مخصوص؟

خلفائے راشدین کے اتباع سنت کی وجہ | اس اصولی بحث کے بعد پیرا گراف ۲۴ میں فاضل حج یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ خلفائے راشدین نے اگر اپنے دور حکومت میں سنت کا اتباع کیا بھی ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں:

”کوئی معتبر شہادت ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ محمد رسول اللہ کے بعد جو چار غلیفہ ہوئے وہ اُن کے اقوال، افعال اور کردار کو کیا اہمیت دیتے تھے لیکن اگر بحث کی خاطر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ افراد کے معاملات اور قومی اہمیت رکھنے والے مسائل کا فیصلہ کرنے میں بڑے وسیع پیمانے پر حدیث کو استعمال کرتے تھے تو وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے کیونکہ وہ ہماری بہ نسبت بلحاظ زمانہ بھی اور بلحاظ مقام بھی محمد رسول اللہ سے قریب تر تھے۔“

ہم عرض کرتے ہیں کہ زمانہ گزشتہ کے کسی واقعہ کے متعلق جو شہادت زیادہ سے زیادہ معتبر ہوتی ممکن ہے اتنی ہی معتبر شہادت اس امر کی موجود ہے کہ چاروں خلفائے راشدین سختی کے ساتھ سنت رسول کی پابندی کرتے تھے، اور اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے زمانے کے حالات حضور کے زمانے کے حالات سے مشابہ تھے، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کے بعد ان کے نزدیک اسلامی قانون کا آئینی مرجع سنت تھی جس سے تجاوز کرنے کا وہ اپنے آپ کو قطعاً مجاز نہ سمجھتے تھے۔ اس باب میں اُن کے اپنے صریح اقوال ہم اسی کتاب کے صفحات ۹۴-۹۹ پر نقل کر چکے ہیں۔ نیز اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری سے اس چودھویں صدی تک ہر صدی کا فقہی ٹریچر علی التوا از خلفاء راشدین کا یہی مسلک بیان کر رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں بعض لوگ ان کے سنت سے تجاوز کی جو نظیریں پیش کر رہے ہیں ان میں سے ایک بھی فی الحقیقت اس بات کی نظر نہیں ہے کہ کس خلفاء راشدین نے کبھی عملاً سنت سے تجاوز

کیا ہے، یا اصولاً اپنے آپ کو ایسے تجاوز کا مجاز سمجھا ہے۔ ان میں سے بعض نظائر کی حقیقت بھی ہم اسی کتاب کے صفحات ۱۸۲-۱۸۶ پر ظاہر کر چکے ہیں۔
امام ابو حنیفہ کا علم حدیث و اتباع سنت | اس کے بعد فاضل حج امام ابو حنیفہ کے مسلک سے استناد فرماتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے:

”مگر ابو حنیفہ نے، جو سنہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور جن کا انتقال ۷۰ سال بعد ہوا، تقریباً ۱۸۰ حدیثیں ان مسائل کا فیصلہ کرنے میں استعمال کیں جو ان کے سامنے پیش کیے گئے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ رسول اللہ کے زمانہ سے اس قدر قریب نہ تھے جہاں قدر پہلے چار خلفاء تھے۔ انہوں نے تمام فیصلوں کی بنا قرآن کی مکتوب ہدایات پر رکھی اور متن قرآن کے الفاظ کے پیچھے ان محرکات کو تلاش کرنے کی کوشش لی جو ان ہدایات کے موجب تھے۔ وہ استدلال و استنباط کی بڑی قوت رکھتے تھے۔ انہوں نے عملی حقائق کی روشنی میں قیاس کی بنیاد پر قانون کے اصول اور نظریات مرتب کیے۔ اگر ابو حنیفہ یہ حق رکھتے تھے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تعبیر موجود الوقت حالات کی روشنی میں کریں، تو دوسرے مسلمانوں کو یہ حق دینے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔“

یہ ارشاد تمام تر غلط روایات اور مفروضات پر مبنی ہے۔ امام ابو حنیفہ کے متعلق ابن خلدون نے نہ معلوم کس سند پر یہ بات لکھ دی تھی کہ ”حدیث قبول کرنے میں ابو حنیفہ اس قدر تشدد تھے کہ ان کے نزدیک ۷۰ سے زیادہ حدیثیں صحیح نہ تھیں۔“ یہ بات چلتے چلتے لوگوں میں اس طرح مشہور ہوئی کہ امام ابو حنیفہ کو صرف ۷۰ حدیثوں کا علم تھا، یا یہ کہ انہوں نے صرف ۷۰ حدیثوں سے مسائل اخذ کیے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل ایک خلاف واقعہ افسانہ ہے۔ آج امام ابو حنیفہ کے سب سے بڑے شاگرد امام ابو یوسف کی مرتب کردہ کتاب الآثار شائع شدہ موجود ہے جس میں انہوں نے اپنے استاد کی روایت کردہ ایک ہزار احادیث جمع کی ہیں۔ اس کے علاوہ امام کے دوسرے شاگرد امام محمد اور امام حسن بن زیاد اللؤلؤی

نے اور امام کے صاحبزادے حماد بن ابی حنیفہ نے بھی اُن کی روایت کردہ احادیث کے مجموعے مرتب کیے تھے۔ پھر مسلسل کئی صدیوں تک بکثرت علماء ان کی مرویات کو ”مسند ابی حنیفہ“ کے نام سے جمع کرتے رہے۔ ان میں سے ۱۵ مسانید کا ایک جامع نسخہ قاضی القضاۃ محمد بن محمود الخوازمی نے ”جامع مسانید الامام الاعظم“ کے نام سے مرتب کیا جسے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ یہ کتابیں اس دعوے کی تردید قاطع ہیں کہ امام ابو حنیفہ صرف ۱۷ احادیث جانتے تھے۔ یا انہوں نے صرف ۱۷ احادیثوں سے استدلال کر کے فقہی مسائل نکالے ہیں۔ علم حدیث میں امام کے استادوں کی تعداد رجن سے انہوں نے روایات لی ہیں، چارہزار تک پہنچتی ہے ان کا شمار اکابر حفاظ حدیث میں کیا گیا ہے۔ ان کی مسانید جمع کرنے والوں میں دارقطنی، ابن شاہین اور ابن عقیل جیسے نامور علماء حدیث شامل ہیں۔ کوئی شخص فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں سے اگر صرف امام طحاوی کی شرح معانی الآثار، ابوبکر حباص کی ”احکام القرآن“ اور امام سرخسی کی ”المبسوط“ ہی کو دیکھے تو اسے یہ غلط فہمی کبھی نہ لاحق ہو کہ امام ابو حنیفہ نے حدیث سے بے نیاز ہو کر صرف تیس اور قرآن پر اپنی فقہ کی بنیاد رکھی تھی۔

پھر حدیث سے استناد کے معاملہ میں امام ابو حنیفہ کا جو مسلک تھا اسے انہوں نے خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”مجھے جب کوئی حکم خدا کی کتاب میں مل جاتا ہے تو میں اسی کو تمام لیتا ہوں۔ اور جب اس میں نہیں ملتا تو رسول اللہ کی سنت اور آپ کے اُن صحیح آثار کو لیتا ہوں جو ثقہ لوگوں کے ہاں ثقہ لوگوں کے واسطے سے معروف ہیں۔ پھر جب نہ کتاب اللہ میں حکم ملتا ہے نہ سنت رسول اللہ میں تو میں اصحاب رسول کے قول (یعنی ان کے اجماع) کی پیروی کرتا ہوں، اور ان کے اختلاف کی صورت میں جس صحابی کا قول چاہتا ہوں قبول کرتا ہوں اور

۱۔ علم حدیث کی اصطلاح میں مسند سے مراد وہ کتاب ہے جس میں ایک شخص کی روایت کردہ احادیث

جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں مگر ان سب کے اقوال سے باہر جا کر کسی کا قول نہیں
 لیتا۔ دوسرے لوگ تو جس طرح اجتہاد کا حق انہیں ہے مجھے بھی ہے۔
 امام ابو حنیفہ کے سامنے ایک مرتبہ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ قیاس کو نص پر ترجیح
 دیتے ہیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا:

”بجدا اُس شخص نے جھوٹ کہا اور ہم پر اقترا کیا جس نے کہا کہ ہم قیاس کو نص
 پر ترجیح دیتے ہیں۔ بھلا نص کے بعد بھی قیاس کی کوئی حاجت رہتی ہے؟
 خلیفہ منصور نے ایک مرتبہ امام کو لکھا کہ میں نے سنا ہے آپ قیاس کو حدیث پر مقدم
 رکھتے ہیں۔ جواب میں انہوں نے لکھا:

”امیر المؤمنین، جو بات آپ کو پہنچی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ میں سب سے پہلے کتاب
 اللہ پر عمل کرتا ہوں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر، پھر ابو بکر و عمر اور
 عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے فیصلوں پر، پھر باقی صحابہ کے فیصلوں پر۔ البتہ سب صحابہ
 میں اختلاف ہو تو قیاس کرتا ہوں۔“

علامہ ابن حزم نے قویہ بات تک لکھا ہے کہ:

”تادم اصحاب ابی حنیفہ اس بات پر متفق ہیں کہ ابو حنیفہ کا مذہب یہ تھا کہ
 ضعیف حدیث بھی اگر مل جائے تو اس کے مقابلے میں قیاس اور رائے کو چھوڑ دیا جائے۔“

الحقاریخ بغداد مخطیب ج ۳ ص ۳۶۸۔ مناقب امام اعظم للموفق المکی ج ۱، ص ۷۹۔ مناقب

امام ابو حنیفہ وصاحبین للذہبی ص ۲۰۔

سہ کتاب المیزان لشعرانی، ج ۱، ص ۶۱

سہ کتاب المیزان لشعرانی، ج ۱، ص ۶۲

لکھ مناقب امام ابو حنیفہ وصاحبین للذہبی ص ۲۱۔ واضح رہے کہ ضعیف حدیث کے معنی جھوٹی حدیث

کے نہیں ہیں۔ اس جگہ ضعیف مراد وہ حدیث ہے جس کی سند تو قوی نہ ہو، مگر جس سے یہ گمان کیا جاسکے کہ یہ حضور
 ہی کا قول ہو گا۔

فاضل حج کے نزدیک وایتِ اعتماد نہ کہنے کے لئے جو اس کے بعد پیرا گراف ۲۵ میں فاضل حج وہ وجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر ان کے نزدیک احادیث ناقابلِ اعتماد بھی ہیں، اور سچا خود حجت و سند بھی نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی بحث کے نکات حسب ذیل ہیں:

(۱) ”تمام فقہاء اسلام اس بات کو بالاتفاق مانتے ہیں کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، جعلی حدیثوں کا ایک حجم غیر اسلامی قوانین کا ایک جائز و مسلم ماخذ بنتا چلا گیا۔ جھوٹی حدیثیں خود محمد رسول اللہ کے زمانے میں ظاہر ہوئی شروع ہو گئی تھیں۔ جھوٹی اور غلط حدیثیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں روایت حدیث پر پابندیاں لگا دیں بلکہ اسے منع کر دیا۔ امام بخاری نے ۶ لاکھ حدیثوں میں سے صرف ۹ ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا۔“

(۲) ”میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس بات سے انکار کرے گا کہ جس طرح قرآن کو محفوظ کیا گیا اُس طرح کی کوئی کوشش رسول اللہ کے اپنے عہد میں احادیث کو محفوظ کرنے کے لیے نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس جو شہادت موجود ہے وہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ نے سختی کے ساتھ احادیث کو محفوظ کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اگر مسلم کی روایات صحیح ہیں تو محمد رسول اللہ نے پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں کو اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ ان کے اقوال اور افعال کو لکھ لیں۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ جس کسی نے ان کی احادیث کو محفوظ کر رکھا ہو وہ انہیں فوراً ضائع کر دے۔ لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیحرقه وحادثوا ولا حرج

لے یہ عجیب بات ہے، شاید اتفاقاً ہی ایسا ہوا ہو، کہ فاضل حج نے اپنے فیصلے میں جتنی آیات اور احادیث کا حوالہ دیا ہے ان کا ترجمہ بھی ساتھ ہی دے دیا ہے، لیکن اس حدیث کا ترجمہ انہوں نے نہیں دیا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: ”مجھ سے کوئی چیز نہ لکھو، اور جس نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو وہ اسے مٹا دے، البتہ زبانی روایت بیان کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں“ اس حدیث کا خط کشیدہ فقرہ فاضل حج کے © rasailqjaraaid.com ہے۔

اسی حدیث یا ایسی ہی ایک حدیث کا ترجمہ مولانا محمد علیؒ نے اپنی کتاب ”دین اسلام“ کے ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں صفحہ ۶۲ پر ان الفاظ میں دیا ہے: روایت ہے کہ ابو ہریرہؓ نے کہا رسول خدا ہمارے پاس آتے اس حال میں کہ ہم حدیث لکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا تم لوگ کیا لکھ رہے ہو۔ ہم نے کہا حدیث جو ہم آپ سے سنتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا یہ کیا! اللہ کی کتاب کے سوا ایک اور کتاب؟ (۳) اس امر کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ محمد رسول اللہ کے فوراً بعد جو چار خلیفہ ہوئے ان کے زمانے میں احادیث محفوظ یا مرتب کی گئی ہوں۔ اس امر واقعہ کا کیا مطلب لیا جانا چاہیے؟ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو گہری تحقیقات کا طالب ہے۔ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ محمد رسول اللہ اور ان کے بعد آنے والے چاروں خلفاء نے احادیث کو محفوظ کرنے کی کوئی کوشش اس لیے نہیں کی کہ یہ احادیث عام انطباق کے لیے نہ تھیں؟

(۴) ”مسلمانوں کی بڑی اکثریت نے قرآن کو حفظ کر لیا۔ وہ جس وقت وحی آتی تھی اس کے فوراً بعد کتابت کا جو سامان بھی میسر آتا تھا اس پر لکھ دیا جاتا تھا اور اس غرض کے لیے رسول کریم نے متعدد تعلیم یافتہ اصحاب کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ لیکن جہاں تک اتحاد کا تعلق ہے وہ نہ یاد کی گئیں نہ محفوظ کی گئیں۔ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کرنے کے بعد مر گئے۔ یہاں تک کہ رسول کی وفات کے چند سو برس بعد ان کو جمع اور مرتب کیا گیا۔“

(۵) ”یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ بعد میں پہلی مرتبہ رسول اللہ کے تقریباً ایک سو سال بعد احادیث کو جمع کیا گیا، مگر ان کا ریکارڈ اب قابل حصول نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کو حسب ذیل اصحاب نے جمع کیا: امام بخاری (متوفی ۲۵۶ھ)۔ امام مسلم (متوفی ۲۶۱ھ)۔ ابو داؤد (متوفی ۲۵۴ھ)۔ جامع ترمذی (متوفی ۲۵۹ھ)۔ سنن النسائی (متوفی ۳۰۳ھ)۔ سنن

۱۔ اس سے مراد لاہوری احمدیوں کے امیر ہیں، مولانا محمد علی جوہر نہیں ہیں۔

کہ فاضل نے یہ نام اسی طرح لکھا ہے۔ حالانکہ جامع ترمذی مصنف کا نام نہیں بلکہ کتاب کا نام ہے مصنف

ابن ماجہ (متوفی ۲۴۱ھ) سنن الدریثمی (متوفی ۲۵۵ھ) بیہقی (دیدائش ۲۵۵ھ)۔ اور امام احمد (دیدائش ۲۴۱ھ) فاضل حج نے اس کے بعد شیعہ محدثین کا ذکر کیا ہے جسے ہم اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کے متعلق کچھ کہنا شیعہ علماء کا کام ہے۔

(۶) ”بہت کم احادیث ہیں جن میں یہ جامعین حدیث متفق ہوں۔ کیا یہ چیز احادیث کو انتہائی مشکوک نہیں بنا دیتی کہ ان پر اعتماد کیا جاسکے؟“

(۷) ”جن لوگوں کو تحقیقات کا کام سپرد کیا گیا ہو وہ ضرور اس بات پر نگاہ رکھیں گے کہ ہزار و ہزار جعلی حدیثیں پھیلائی گئی ہیں تاکہ اسلام اور محمد رسول اللہ کو بدنام کیا جائے۔“

(۸) ”انہیں اس بات کو بھی نگاہ میں رکھنا ہو گا کہ عربوں کا حافظہ خواہ کتنا ہی قوی ہو، کیا صرف حافظہ سے نقل کی ہوئی باتیں قابل اعتماد سمجھی جاسکتی ہیں؟ آخر آج کے عربوں کا حافظہ بھی تو دیا ہی ہے، جیسا ۱۳ سو برس پہلے ان کا حافظہ رہا ہو گا۔ آج کل عربوں کا حافظہ جیسا کچھ ہے وہ ہمیں یہ رائے قائم کرنے کے لیے ایک اہم سراغ کا کام دے سکتا ہے کہ جو روایات ہم تک پہنچی ہیں کیا ان کے صحیح اور حقیقی ہونے پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟“

(۹) ”عربوں کے مبالغے نے، اور جن راویوں کے ذریعہ سے یہ روایات ہم تک پہنچی ہیں ان کے اپنے معتقدات اور تعصبات نے بھی ضرور بڑی حد تک نقل روایت کو مسخ کیا ہو گا۔ جب الفاظ ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچتے ہیں، وہ ذہن خواہ عرب کا ہو یا کسی اور کا، بہر حال ان الفاظ میں ایسے تغیرات ہو جاتے ہیں جو ہر ذہن کی اپنی ساخت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہر ذہن ان کو اپنے طرز پر موڑتا توڑتا ہے، اور حکمہ الفاظ

۱۔ یہ بھی مصنفین کے نہیں، کتابوں کے نام ہیں سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کی تو ابھی تک منات نہیں ہوئی ہے۔
۲۔ ہمارے علم میں اس نام کا کوئی مصنف نہیں گزرا ہے، نہ کسی ایسی کتاب جسے ہم واقف ہیں جس کا

بہت سے ذہنوں سے گزر کر آتے ہوں تو ایک شخص تصور کر سکتا ہے کہ ان میں کتنا بڑا تغیر ہو جائے گا۔“

وجہ مذکورہ پر تنقید | یہ نو نکات ہم نے خاضل حج کے اپنے الفاظ میں، ان کی اپنی ترتیب کے ساتھ نقل کر دیتے ہیں اب ہم ان کا علمی جائزہ لیکر دکھیں گے کہ یہ کہاں تک صحیح ہیں، اور ان کو احادیث پر اعتماد نہ کرنے، اور سنت کو محبت نہ ماننے کے لیے کس حد تک دلیل بنایا جاسکتا ہے۔

کیا جھوٹی حدیثیں اسلامی قانون کا ماخذ بنی ہیں؟ | سب سے پہلے ان کے نکتہ نمبر ایک اور سات کو لیجیے۔ یہ بات بالکل خلافت واقعہ ہے کہ جعلی حدیثوں کے ایک حجم غصیر کا اسلامی قانون کے ماخذ میں داخل ہو جانا تمام فقہاء اسلام بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں فقہاء اسلام اس بات کو تو بے شک تسلیم کرتے ہیں کہ جعلی حدیثیں کثرت سے گھڑی گئیں، لیکن ان میں سے کسی نے اگر یہ تسلیم کیا ہو کہ یہ حدیثیں اسلامی قانون کا ماخذ بھی بن گئیں، تو ایسے ایک ہی فقیہ، یا محدث یا معتبر عالم دین کا نام ہمیں بتایا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس وقت سے جعلی احادیث ظاہر ہونی شروع ہوئیں اسی وقت سے محدثین اور ائمہ مجتہدین اور فقہاء اپنے اپنی تمام کوششیں اس بات پر مرکوز کر دیں کہ یہ گندانا لہ اسلامی قوانین کے سوتلوں میں نفوذ نہ کرنے پائے۔ ان کوششوں کا زیادہ تر زور ان احادیث کی تحقیقات پر صرف ہوا ہے جن سے کوئی حکم شرعی ثابت ہوتا تھا اور اسلامی عدالتوں کے قاضی بھی اس معاملے میں سخت چوکتے رہے ہیں کہ محض قال رسول اللہ سن کر وہ کسی نو جداری یا دیوانی مقدمے کا فیصلہ نہ کر دیں بلکہ اُس قول کی پوری چھان بین کریں جس کی رو سے کوئی ملزم چھوٹتا یا سزا پا سکتا ہو، یا کوئی مدعی کسی معاملے میں اپنا حق ثابت کر سکتا ہو یا اس سے محروم ہو سکتا ہو۔ آغاز اسلام کے حاکمان عدالت انصاف کے معاملے میں ہمارے فاضل حج اور ان کے رفقاء سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ وہ کہتے تھے۔ آخر ان کے لیے یہ کیسے ممکن

تھا کہ ضروری تحقیقات کے بغیر کسی چیز کو قانونی حکم تسلیم کر کے فیصلے کر ڈالتے؛ اور مقدمات کے فریقین آخر کس طرح ٹھنڈے دل سے یہ برداشت کر سکتے تھے کہ ایک قانونی حکم کا ثبوت ہم پہنچے بغیر کسی کچی کچی روایت پر ان کے خلاف فیصلہ ہو جاتے؛ اس لیے درحقیقت نہ یہ بات صحیح ہے کہ اسلامی قوانین کے مآخذ میں جعلی حدیثیں داخل ہوتی ہیں، اور نہ یہی بات درست ہے کہ فقہاء اسلام نے اُن کے داخل ہو جانے کو بالاتفاق مانا ہے۔

کیا جھوٹی حدیثیں حضورؐ کے زمانے ہی میں رواج پانے لگی تھیں؟ | فاضل حج کا یہ ارشاد بھی سخت غلط فہمی میں ڈالنے والا ہے کہ جھوٹی حدیثیں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ظاہر ہوئی شروع ہو گئی تھیں۔ دراصل اس کی حقیقت یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں ایک شخص مضافات مدینہ کے ایک قبیلے کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا، مگر لڑکی والوں نے انکار کر دیا تھا۔ ہجرت کے بعد شروع زمانے میں وہی شخص ایک حلقہ پہنچے ہوئے اس قبیلے میں پہنچا اور جاگو اس نے لڑکی والوں سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ حلقہ پہنایا ہے اور مجھ کو اس قبیلے کا حاکم بنا دیا ہے۔ قبیلے والوں نے اسے اتار لیا اور خاموشی کے ساتھ حضورؐ کو اس معاملے کی اطلاع دی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ”جھوٹ کہا اس دشمن خدا نے“۔ پھر ایک آدمی کو حکم دیا کہ جاؤ، اگر اسے زندہ پاؤ تو قتل کر دو، اور اگر مردہ پاؤ تو اس کی لاش جلا ڈالو۔ وہ شخص وہاں پہنچا تو دیکھا کہ مجرم کو سانپ نے کاٹا ہے اور وہ مر چکا ہے۔ چنانچہ حکم کے مطابق اس کی لاش جلا ڈالی گئی۔ اس کے بعد حضورؐ نے اعلان عام فرمایا اور بعد میں بھی بار بار تاکید آپؐ یہ اعلان فرماتے رہے کہ جو شخص میرا نام لیکر جھوٹی بات کہے وہ جہنم میں جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس شدید احتیاطی کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً ۳۰-۴۰ سال تک جھوٹی حدیث لکھ کر پھیلانے کا پھر کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

۱۔ اس واقعہ کو مشہور محدث عبد اللہ بن عبدی نے اپنی کتاب ”الکامل فی معرفۃ الضعفاء والمتروکین“

حضرت عمرؓ نے کثرتِ روایت کیوں منع کیا؟ ان کا یہ ارشاد بھی ایک دعویٰ بلا ثبوت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے جھوٹی حدیثیں آتی بڑھ گئی تھیں کہ حضرت عمرؓ کو روایتِ حدیث پر پابندی لگا دینی پڑی، بلکہ اسے بالکل روک دینا پڑا۔ اگر اس بیان کے لیے کوئی تاریخی سند موجود ہو تو براہِ کرم اس کا حوالہ دیا جائے۔ فی الواقع اُس زمانے میں وضعِ حدیث کا کوئی فتنہ رونما نہیں ہوا تھا۔ تاریخ اس کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ حضرت عمرؓ جس وجہ سے کثرتِ روایت کو پسند نہ کرتے تھے وہ دراصل یہ تھی کہ جنوبی حجاز کے مختصر خطے کے سوا اُس وقت تک عرب میں قرآن مجید کی عام اشاعت نہ ہوئی تھی۔ عرب کا بیشتر حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری حصے میں اسلام کے زیرِ نگیں آیا تھا اور عام باشندگانِ عرب کی تعلیم کا انتظام ابھی پوری طرح شروع بھی نہ ہوا تھا کہ حضورؐ کی وفات، اور پھر خلافتِ صدیقی میں فتنہ ارتداد کے رونما ہونے سے یہ کام درہم برہم ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کا عہد وہ تھا جس میں مسلمانوں کو اطمینان کے ساتھ عوام کی تعلیم کے لیے کام کرنے کا موقع ملا۔ اُس وقت یہ ضروری تھا کہ پہلے ساری قوم کو قرآن کے علم سے روشناس کرا دیا جائے، اور ایسا کوئی کام نہ کیا جاتے جس سے قرآن کے ساتھ کوئی دوسری چیز خلط ملط ہو جائے کا اندیشہ ہو۔ اگر وہی صحابہ جو حضورؐ کی طرف سے لوگوں کو قرآن پہنچا رہے تھے، ساتھ ساتھ حضورؐ کی احادیث بھی بیان کرتے جاتے تو سخت خطرہ تھا کہ بدویوں کی ایک بڑی تعداد آیاتِ قرآنی کو احادیثِ نبوی کے ساتھ گڈمڈ کر کے یاد کر لیتی۔ اس مصلحت کو حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر خود بیان فرمایا ہے۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں قلم بند کر لی جائیں۔ اس کے متعلق صحابہ انہوں نے مشورہ لیا۔ سب نے اسے دی کہ یہ کام ضرور کرنا چاہیے۔ مگر حضرت عمرؓ اسے شروع کرتے ہوئے ایک مہینے تک جھگکتے رہے اور اللہ سے دعا کرتے رہے کہ جس چیز میں خیر ہو اس کی طرف وہ آپ کی رہنمائی کر دے۔ آخر کار ایک مہینے کے بعد ایک روز انہوں نے فرمایا کہ ”میں سنتیں لکھوانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر مجھے خیال آیا کہ تم سے پہلے ایک قوم گزر چکی ہے

جس نے دوسری کتابیں لکھیں اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ لہذا خدا کی قسم، میں کتاب اللہ کے ساتھ دوسری کوئی چیز ہرگز شامل نہ کروں گا۔

امام بخاریؒ کی چھ لاکھ حدیثوں کا افسانہ | فاضل حج کی ایک اور بات جو سخت غلط فہمی پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ”امام بخاریؒ نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف ۹ ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا۔ اس سے ایک شخص یہ تاثر لیتا ہے کہ چھ لاکھ میں سے بس وہ ۹ ہزار تو صحیح تھیں جو امام بخاریؒ نے لے لیں، اور باقی ۵ لاکھ ۹ ہزار جھوٹی حدیثیں قوم میں پھیلی ہوئی تھیں حالانکہ اصل حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ دراصل محدثین کی اصطلاح میں ایک واقعہ اگر ایک سلسلہ سند سے نقل ہو تو وہ ایک حدیث ہے، اور وہی ایک واقعہ مثلاً دس دس یا پچاس مختلف سندوں سے نقل ہو کر آئے تو وہ اسے دس، بیس یا پچاس حدیثیں کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ کے زمانہ تک پہنچتے پہنچتے حضورؐ کے ایک ایک ارشاد، اور آپؐ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کو بکثرت راوی بہت سی مختلف سندوں سے روایت کرتے تھے، اور اس طرح چند ہزار حدیثیں کئی لاکھ حدیثوں کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ امام بخاریؒ کا طریقہ یہ تھا کہ حقیقی سندوں سے کوئی واقعہ انہیں پہنچا تھا انہیں وہ اپنی شرائط صحت یعنی سند کی صحت نہ کہ اصل واقعہ کی صحت، کے مطابق جلدیختے تھے اور ان میں سے جس سند یا جن سندوں کو وہ سب سے زیادہ معتبر سمجھتے تھے ان کا انتخاب کر لیتے تھے۔ مگر انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو حدیثیں انہوں نے منتخب کی ہیں بس وہی صحیح ہیں اور باقی تمام روایات غیر صحیح ہیں۔ اُن کا اپنا قول یہ ہے کہ میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث داخل نہیں کی ہے جو صحیح نہ ہو، مگر بہت سی صحیح حدیثیں چھوڑ

لے تدریب الراوی ص ۱۵۱ بحوالہ المدخل للبیہقی۔

۱۔ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی رفع کر دینی ضروری ہے۔ علم حدیث کی اصطلاح میں صحیح سے مراد وہ حدیث ہے جس کی سند میں قطعاً شرائط پائی جاتی ہوں۔ اس سے کم تر درجے کی سندوں کے لیے وہ دوسری اصطلاح استعمال کرتے ہیں مگر علم حدیث سے ناواقف لوگ ”صحیح“ کے لفظ کو سچی حدیث کے معنی میں لے لیتے ہیں اور یہ گمان کر لیتے ہیں کہ اس کے ماسوا جتنی حدیثیں ہیں سب جھوٹی ہیں۔

© rasailojaraid.com

دی ہیں تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے؛ بلکہ ایک اور موقع پر وہ اس کی تصریح بھی کرتے ہیں کہ ”میں نے جو صحیح حدیثیں چھوڑ دی ہیں وہ میری منتخب کردہ حدیثوں سے زیادہ ہیں“ اور یہ کہ مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد ہیں؛ قریب قریب یہی بات امام مسلم نے بھی کہی ہے۔ ان کا قول ہے میں نے اپنی کتاب میں جو روایتیں جمع کی ہیں ان کو میں صحاح کہتا ہوں مگر یہ میں نے کبھی نہیں کہا کہ جو روایت میں نے نہیں لی ہے وہ ضعیف ہے۔“

جھوٹی حدیثیں آخر گھڑی کیوں گئیں؟ | فاضل حج نے اس بات کو بڑی اہمیت دی ہے کہ ہزار در ہزار حدیثیں گھڑی گئیں اور اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ تحقیق کرنے والے اس پر خصوصیت کے ساتھ غور کریں لیکن ہم عرض کرتے ہیں کہ تحقیق کرنے والوں کو ساتھ ساتھ اس سوال پر بھی غور کرنا چاہیے کہ یہ ہزار تو جھوٹا حدیثیں اُس زمانے میں آخر گھڑی کیوں گئیں؟ ان کے گھر جانے کی وجہ یہی تو تھی کہ حضور کا قول و فعل حجت تھا اور آپ کی طرف ایک غلط بات منسوب کر کے جھوٹے لوگ کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اگر وہ حجت نہ ہوتا اور کسی شخص کے لیے اپنے کسی دعوے کے حق میں حدیث اٹانا اور نہ لانا یکساں بے فائدہ ہوتا تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ ایک غلط بات تصنیف کرنے کی تکلیف اٹھاتا۔ دنیا میں ایک جعل ساز وہی نوٹ تو بناتا ہے جو بازار میں قدر و قیمت رکھتا ہو جس نوٹ کی کوئی قیمت نہ ہو اسے آخر کون اتنی جعلی بنائے گا؟ اب اگر فرض کیجیے کہ کسی وقت جعل سازوں کا کوئی گروہ پاکستان کے ہزاروں جعلی نوٹ بنا ڈالے تو کیا اس پر کسی کا یہ استدلال کرنا صحیح ہوگا کہ پاکستان کے سارے نوٹوں کو اٹھا کر پھینک دینا چاہیے کیونکہ جعلی نوٹوں کی موجودگی میں سرے سے انس کرنسی کا ہی کوئی اعتبار نہیں ہے؛ ملک کا ہر خیر اندیش آدمی تو فوراً اس فکر میں لگ جائے گا کہ ایسے جعل سازوں کو پکڑا جائے اور ملک کی

۱۔ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۸۰۸۔ تہذیب النودی ج ۱ ص ۷۴۔ طبقات نسبی ج ۲ ص ۷

۲۔ شروط الاثنا الخمسة ص ۴۹

کونسی کو اس خطرے سے بچایا جائے ٹھیک یہی اثر آغاز اسلام میں جھوٹی احادیث کا فتنہ رونما ہونے سے اسلام کے خیر اندیش لوگوں نے لیا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ایک ایک واضح حدیث کا پتہ چلا کر اس کا نام رجال کی کتابوں میں ثبت کر دیا، ایک ایک جھوٹی حدیث کی تحقیق کر کے احادیث موضوعہ کے مجموعے مرتب کر دیئے، احادیث کی صحت و سقم جانچنے کے لیے بڑے سخت اصول قائم کر کے لوگوں کو اس قابل بنادیا کہ صحیح اور جعلی حدیثوں میں امتیاز کر سکیں اور کسی وقت بھی کوئی جھوٹی حدیث اسلامی قانون کے ماتخذ میں راہ نہ پاسکے۔ البتہ منکرین سنت کا طرز فکر اس زمانے میں بھی یہی تھا کہ غلط احادیث کے پھیل جانے سے سارا ذخیرہ حدیث مشتبہ ہو گیا ہے لہذا تمام احادیث کو اٹھا کر ہینک دینا چاہیے۔ انہیں اس کی پروا نہ تھی کہ سنت رسول کو ساقط کر دینے سے اسلامی قانون پر کس قدر تباہ کن اثر پڑے گا اور خود اسلام کی صورت کس بڑی طرح مسخ ہو کر رہ جائے گی۔

استدلال کی تین غلط بنیادیں | اب ہم فاضل حج کے نکات نمبر ۲-۳ اور ۴ کو لیتے ہیں۔ ان نکات میں ان کے استدلال کا سارا انحصار تین باتوں پر ہے جو بجائے خود غلط یا اہل حقیقت سے بہت مختلف ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو لکھنے سے منع کر دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ حضور کے زمانے میں اور آپ کے بعد خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی قرآن کو محفوظ کرنے کا تو اہتمام کیا گیا، مگر احادیث کے محفوظ کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ تیسرے یہ کہ احادیث صحابہ اور تابعین کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں، وہ کبھی کبھار اتفاقاً کسی کے سامنے ان کا ذکر کر دیا کرتے تھے، اور ان روایات کو جمع کرنے کا کام حضور کی وفات کے چند سو برس بعد کیا گیا۔ ان تین خلاف واقعہ بنیادوں پر فاضل حج سوالیہ انداز میں اس نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں کہ احادیث کے ساتھ یہ بڑا ڈاس ایسے کیا گیا کہ دراصل وہ محض ایک وقتی حیثیت رکھتی تھیں، دنیا بھر کے لیے اور ہمیشہ کے لیے ان کو ماتخذ

سطور ذیل میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ ان تینوں باتوں میں جن پر اس نتیجے کی بنا رکھی گئی ہے، صداقت کا جو ہر کس قدر ہے، اور خود وہ نتیجہ جو ان سے برآمد کیا گیا ہے، بجائے خود کہاں تک صحیح ہے۔

کتابت حدیث کی ابتدائی ممانعت اور اس کے وجوہ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن دو حدیثوں کا فاضل مصنف نے حوالہ دیا ہے ان میں صرف احادیث لکھنے سے منع کیا گیا ہے، ان کو زبانی روایت کرنے سے منع نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ان میں سے ایک حدیث میں تو بالفاظِ صریح حضور نے فرمایا ہے وحدّثوا عني ولا حرج "میری باتیں زبانی بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

لیکن دراصل یہ بات سرے سے ہی غلط ہے کہ صرف ان دو حدیثوں کو لیکر ان سے نتائج اخذ کر ڈالے جائیں، اور اس سلسلے کے تمام دوسرے متعلقہ واقعات کو نظر انداز کر دیا جائے پہلی بات جو اس باب میں جانشی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں مبعوث ہوئے ہیں اُس وقت عرب کی پوری قوم اُن پرچہ تھی اور اپنے سارے معاملات حافظے اور زبان سے چلاتی تھی۔ قریش جیسے ترقی یافتہ قبیلے کا حال مورخ بلاذری کی روایت کے مطابق یہ تھا کہ اس میں صرف اُردمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مدینہ کے انصار میں بلاذری ہی کے بقول اسے زیادہ آدمیوں کو لکھنا پڑھنا نہ آتا تھا۔ کتابت کے لیے کاغذ ناپید تھا۔ جلیقوں اور بڈیوں اور کھجور کے پتوں پر تحریریں لکھی جاتی تھیں۔ ان حالات میں جب حضور مبعوث ہوئے تو آپ کے سامنے اولین کام یہ تھا کہ قرآن مجید کو اس طرح محفوظ کریں کہ اس میں کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ لکھنے والے چونکہ گنے چنے آدمی تھے، اس لیے آپ کو خطرہ تھا کہ جو لوگ وحی کے الفاظ اور آیات لکھ رہے ہیں، وہی لوگ اگر آپ ہی سے سن کر آپ کے حوالہ سے دوسری چیزیں بھی لکھیں گے تو قرآن آمیزش سے نہ بچ سکے گا۔ آمیزش نہ ہوگی تو کم از کم شک پڑ جائے گا کہ ایک چیز آرمیزش سے نہ بچ سکے گا۔ اس بنا پر ابتدائی دور میں

حضور نے احادیث لکھنے سے منع فرمادیا تھا۔

کتابت حدیث کی عام اجازت مگر یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہیں رہی۔ مدینہ طیبہ پہنچنے کے تھوڑی مدت بعد آپ نے اپنے اصحاب اور ان کے بچوں کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دلوانے کا خود اہتمام فرمایا، اور سب ایک اچھی خاصی تعداد پر بھی لکھی ہو گئی تو احادیث لکھنے کی آپ نے اجازت دیدی۔ اس سلسلے میں مستند روایات یہ ہیں:

(۱) عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا وہ لکھ لیتا تھا۔ لوگوں نے مجھے اس سے منع کیا اور کہا رسول اللہ ایک انسان ہیں کبھی رضا کی حالت میں بولتے ہیں اور کبھی غضب کی حالت میں تم سب کچھ لکھ ڈالتے ہو؟ اس پر میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک حضورؐ سے پوچھ نہ لوں آپ کی کوئی بات نہ لکھوں گا۔ پھر جب حضورؐ سے میں نے پوچھا تو آپ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اکتب فوالذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الا حق۔ لکھو، اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ (ابوداؤد۔ مسند احمد۔ دارمی۔ حاکم۔ بیہقی فی المدخل)

(۲) ابو ہریرہؓ کہتے ہیں، انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا: میں آپؐ سے بہت سی باتیں سنتا ہوں مگر یاد نہیں کھ سکتا۔ حضورؐ نے فرمایا استعن بجمیعت وادما بیدہ الی الخط۔ اپنے ہاتھ سے مدد لو اور پھر ہاتھ کے اشارہ سے بتایا کہ کھ لیا کرو۔ (ترمذی، (۳) ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا۔ بعد میں دین کے ایک صاحب، ابو شاہ نے عرض کیا کہ میرے بیٹے اسے لکھو ادبیجئے حضورؐ نے فرمایا اکتبوا لابی شاہ۔ ابو شاہ کو لکھ کر دیدو۔ (بخاری۔ احمد۔ ترمذی)۔ اسی واقعہ کی تفصیل سے جو حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک دوسری روایت میں یوں بیان ہوئی ہے کہ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے ایک خطبہ دیا اور قتل کے معاملہ میں چند

قرآن میں بیان فرماتے۔ اہل یمن میں سے ایک شخص (ابو شاہ) نے اٹھ کر عرض کیا کہ یہ احکام مجھے لکھوا دیں۔ آپ نے فرمایا اسے یہ احکام لکھ کر دے دیتے ہیں۔ بخاری

(۴) ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ صحابہ میں سے کوئی مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ رکھتا تھا مگر عبداللہ بن عمر بن عاص اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی لئے کہ وہ لکھ دیتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا۔ بخاری۔ مسلم۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی،

۵، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مختلف لوگوں نے پوچھا۔ اور ایک مرتبہ برسر منبر بھی آپ نے پوچھا کیا کہ آیا آپ کے پاس کوئی ایسا علم بھی ہے جو خاص طور پر آپ ہی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ میرے پاس صرف کتاب اللہ ہے، اور یہ چند احکام ہیں جو میں نے حضور سے سن کر لکھ لیے تھے۔ پھر وہ تحریر آپ نے نکال کر دکھائی۔ اس میں زکوٰۃ اور قانونی تعزیرات اور حرم مدینہ، اور ایسے ہی بعض اور معاملات کے متعلق چند احکام تھے، بخاری، مسلم، احمد اور نسائی نے اس مضمون کی متعدد روایات مختلف سندوں کے ساتھ نقل کی ہیں۔

اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں اپنے حکام کو مختلف علاقوں کی طرف بھیجے وقت متعدد مواقع پر فوجداری اور دیوانی قوانین اور زکوٰۃ اور میراث کے احکام لکھوا کر دیتے تھے جن کو ابوداؤد، نسائی، دارقطنی، دارمی، طبقات ابن سعد، کتاب الاموال لابن عثیمہ، کتاب الخراج لابن یوسف اور المحلی لابن حزم وغیرہ کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

احادیث کو زبانی روایت کرنے کی بہت افزائی بلکہ تاکید یہ تو بے معادہ کتابت

حدیث کا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اہل عرب ہزاروں برس سے اپنے کام کتابت کے بجائے حفظ و روایت اور زبانی کلام سے چلانے کے عادی تھے، اور یہی عادت ان کو اسلام کے ابتدائی دور میں بھی برسوں تک رہی۔ ان حالات میں قرآن کو محفوظ کرنے کے لیے تو کتابت ضروری سمجھی گئی کیونکہ اس کا حفظ آسانی سے ہو سکتا تھا۔ اس کی مثال اسی ترتیب کے ساتھ

جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی تھی، محفوظ کرنا مطلوب تھا۔ لیکن حدیث کے معاملہ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ کیونکہ اس میں مخصوص الفاظ اور ان کی خاص ترتیب کے وحی ہونے کا نہ دعویٰ تھا نہ تصور۔ بلکہ مقصود صرف اُن احکام اور تعلیمات و ہدایات کو یاد رکھنا اور پہنچانا تھا جو صحابہ کو حضور سے ملی تھیں۔ اس باب میں زبانی نقل و روایت کی محض کھلی اجازت ہی نہ تھی بلکہ بکثرت اتحاد سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بار بار اور بکثرت اس کی تاکید فرمائی تھی۔ مثال کے طور پر چند احادیث ملاحظہ ہوں:-

(۱) زید بن ثابت، عبداللہ بن مسعود، جابر بن مطعم اور ابو اللہ اور رضی اللہ عنہم حضور کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں: "نصر اللہ امرأ سمع منا حديثاً فحفظه حتى يبلغه فوب حامل فقه الى من هو افقه منه" اور حامل فقه یعنی جس شخص کو خوش و خرم رکھے جو ہم سے کوئی بات سنے اور دوسروں تک پہنچائے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص سمجھ کی بات کسی ایسے شخص کو پہنچا دیتا ہے جو اس سے زیادہ فقیہ ہو۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص خود فقیہ نہیں ہوتا مگر فقہ پہنچانے والا بن جاتا ہے۔ (ابوداؤد - ترمذی - احمد، ابن ماجہ، دارمی)

(۲) ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا: "يبلغ الغائب الشاهد عسى ان يبلغ من هو اوعى منه" جو حاضر ہے وہ ان لوگوں تک پہنچا دے جو حاضر نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی تک پہنچا دے جو اس سے زیادہ سمجھ رکھتا ہو۔ (بخاری و مسلم)

(۳) ابو شریح کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے دوسرے دن حضور نے خطبہ دیا جسے میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے اور خوب یاد رکھا ہے اور وہ موقع اب تک میری آنکھوں میں گمایا ہوا ہے۔ خطبہ ختم کر کے حضور نے فرمایا: "يبلغ الشاهد الغائب" جو حاضر ہیں وہ ان لوگوں تک پہنچا دیں جو حاضر نہیں ہیں۔ (بخاری)

(۴) حجۃ الوداع کے موقع پر بھی تقریر ختم کر کے آپ نے قریب قریب وہی بات فرمائی تھی جو اوپر والی دونوں حدیثوں میں منقول ہوئی ہے۔

(۵) بنی عبدالنقیس کا وفد جب بحرین سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے چلتے وقت عرض کیا کہ ہم بہت دور دراز کے باشندے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان کفار حائل ہیں۔ ہم صرف حرام مہینوں میں ہی حاضر خدمت ہو سکتے ہیں۔ لہذا آپ ہمیں کچھ ایسی ہدایات دیں جو ہم واپس نکال کر اپنی قوم کے لوگوں کو بتائیں اور جنت کے مستحق ہوں۔ حضورؐ نے جواب میں ان کو دین کے چند احکام بتائے اور فرمایا حفظوہ واخلروہ من وراءکم۔ ”ان باتوں کو یاد کر لو اور وہاں کے لوگوں کو بتادو“ (بخاری و مسلم)

کیا یہ ہدایات اور بار بار کی تاکیدیں یہی ظاہر کرتی ہیں کہ حضور روایت حدیث کی حوصلہ افزائی نہ کرنا چاہتے تھے؟ یا یہ کہ آپ اپنے احکام کو وقتی احکام سمجھتے تھے اور یہ نہ چاہتے تھے کہ لوگوں میں وہ پھیلیں اور عام حالات پر ان کا انطباق کیا جانے لگے؟

جھوٹی حدیث روایت کرنے پر سخت وعید اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی احادیث کی نشر و اشاعت کے لیے تاکید فرماتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ آپ نے ان کی حفاظت اور ان میں جھوٹ کی آمیزش سے احتراز کی بھی سخت تاکید فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ، ابوہریرہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا من کذب علی متعمداً فلینبوا مقعدہ من النار۔ جو شخص میرا نام لے کر قصداً جھوٹی بات میری طرف منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے۔ بخاری و ترمذی

ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا احذثوا عنی ولا حرج و من کذب علی متعمداً فلینبوا مقعدہ من النار۔ میری باتیں روایت کرو، اس میں کوئی حرج نہیں، مگر جو میری طرف جان بوجھ کر جھوٹی بات منسوب کرے گا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے گا۔ (مسلم)

ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا اتقوا الحدیث عفی الاما علمتم فمن کذب علی متعمداً فلینبوا مقعدہ من النار۔ میری باتیں روایت کرو، جو باتیں تم کو بتائی ہیں ان سے احتراز کرو، مگر جو میری طرف جان بوجھ کر جھوٹی بات منسوب کرے گا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے گا۔ (مسلم)

کہ ہمیں یہ علم نہ ہو کہ میں نے وہ کہی ہے۔ کیونکہ جو میری طرف جھوٹی بات منسوب کر یگا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے گا۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا لا تکذبوا علی فانہ من کذب علی فلیبج النار۔ "میرا نام لے کر جھوٹ نہ بولو، کیونکہ جو شخص میرا نام لے کر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں داخل ہوگا۔" (بخاری)

حضرت سلمہؓ کہتے ہیں سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول من یقل علی ما لہ من اقل فلینبوا مقعدہ من النار۔ "میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص میرا نام لے کر وہ بات کہے جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے گا۔" (بخاری)

کیا یہ بار بار کی سخت وعید یہی ظاہر کرتی ہے کہ حضورؐ کے ارشادات کی دین میں کوئی اہمیت نہ تھی؟ اگر آپؐ کی سنت کی کوئی ثانوی حیثیت دین میں نہ ہوتی اور اس سے احکام دین کے متاثر ہونے کا خطرہ نہ ہوتا تو کیا ضرورت پڑی تھی کہ جہنم کی وعید سنا سنا کر لوگوں کو جھوٹی حدیث و سنت کرنے سے روکا جاتا؟ بادشاہ اور رئیسوں کی طرف تاریخوں میں بہت سی غلط باتیں منسوب ہو جاتی ہیں۔ ان سے آخر دین پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر حضورؐ کی سنت کی بھی یہی حیثیت ہے تو آپؐ کی تاریخ کو مسخ کر دینے کی یہ سزا کیوں ہو کہ آدمی کو اصل جہنم کر دیا جائے؟

سنت رسولؐ کے حجت ہونے کی صریح دلیل | اس سلسلے میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب

ایک مسئلے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی صاف صاف تصریحات موجود ہوں تو اس کے بارے میں غیر متعلق چیزوں سے نتائج نکالنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اپنے رسولؐ کو تشریح کتاب اللہ کے اختیارات بھی دیئے ہیں اور شرعی اختیارات بھی۔ سورہ نحل کی آیت ۴۴، سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ اور سورہ حشر کی آیت ۷، جنہیں اس سے پہلے ہم نقل کر چکے ہیں، اس معاملے میں بالکل واضح ہیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صاف

ابو رافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا اُفیت احدکم منکمنا علی اریکتہ یا تیہ الامر من امری مما امرت بہ او نہیت فیقول لا ادری، ما وجدنا فی کتاب اللہ اتباعنا۔ میں ہرگز نہ پاؤں تم میں سے کسی شخص کو کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگاتے بیٹھا ہو اور اس کو میرے احکام میں سے کوئی حکم پہنچے، خواہ میں نے کسی چیز سے منع کیا ہو یا کسی کام کے کرنے کا حکم دیا ہو۔ اور وہ سن کر کہے کہ میں نہیں جانتا، جو کچھ ہم کتاب اللہ میں پائیں گے اس کی پیروی کریں گے۔ (احمد، شافعی، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ، بیہقی فی دلائل النبوة)

مقدم بن معدیکرب کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ، الا یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاجلوه وما وجدتم فیہ من حرام فحرموه، وان ما احمر رسول اللہ کما حرما اللہ، الا لا یحیل لکم الحمار الاہلی، ولا کل ذی ناب من السباع۔۔۔ خبردار رہو مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ویسی ہی ایک اور چیز بھی۔ خبردار ایسا نہ ہو کہ کوئی پیٹ بھر شخص اپنی مسند پر بیٹھا ہو ایہ کہنے لگے کہ بس تم قرآن کی پیروی کرو، جو کچھ اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ حالانکہ دراصل جو کچھ اللہ کا رسول حرام قرار دے وہ ویسا ہی حرام ہے جیسے اللہ کا حرام کیا ہوا۔ خبردار رہو تمہارے لیے پالتو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ کوئی کچلیوں والا زندہ حلال ہے۔۔۔ (ابو داؤد، ابن ماجہ، دارمی، حاکم، عریاض بن ساریہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خصبہ دینے کھڑے ہوئے اور اس میں فرمایا ایحسب احدکم عنکمنا علی اریکتہ یظن ان اللہ لم یحرم شیئاً الا ما فی القرآن۔ الا وانی واللہ قد امرت ووعظت ونہیت عن اشیاء انما مثل القرآن او اکثر وان اللہ لم یحیل لکم ان تدخلوا بیوت اہل الکتاب الا باذن ولا ضرب نساءہم ولا اکل ثمارہم۔ اذا اعطوکم الذی علیہم یدکیا تم میں سے کوئی شخص اپنی مسند پر تکیہ لگاتے یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اللہ نے کوئی چیز حرام نہیں کی سوائے ان چیزوں کے جو قرآن میں بیان کر دی گئی ہیں، خبردار

رہو، خدا کی قسم میں نے جن باتوں کا حکم دیا ہے اور جو نصیحتیں کی ہیں اور جن کاموں سے منع کیا ہے وہ بھی قرآن ہی کی طرح ہیں بلکہ کچھ زیادہ۔ اللہ نے تمہارے لیے ہرگز یہ حلال نہیں کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں اجازت کے بغیر گھس جاؤ۔ یا ان کی عورتوں کو مارو پیٹو، یا ان کے پھل کھا جاؤ جبکہ وہ اپنے واجبات ادا کر چکے ہیں۔ (ابوداؤد)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا فمن رغب عن سنتي فليس مني۔ جو شخص میری سنت سے منہ پھیرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ (بخاری و مسلم)

اللہ اور رسول کے ان صاف صاف ارشادات کے بعد آخر اس استدلال میں کیا وزن رہ جاتا ہے کہ حدیثیں چونکہ لکھوائی نہیں گئیں اس لیے وہ عام انطباق کے لیے نہ تھیں۔

کیا قابل اعتماد صرف لکھی ہوئی چیز ہی ہوتی ہے؟ فاضل حج بار بار لکھنے کے مسئلے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک لکھنا اور محفوظ کرنا گویا ہم معنی ہیں۔ ان کے استدلال کا بڑا انحصار اس خیالی پر ہے کہ قرآن اس لیے قابل اعتماد و استناد ہے کہ وہ لکھوایا گیا، اور احادیث اس لیے قابل اعتماد و استناد نہیں ہیں کہ وہ عہد رسالت اور عہد خلافت میں نہیں لکھوائی گئیں۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن کو جس وجہ سے لکھوایا گیا وہ یہ تھی کہ اس کے الفاظ اور معانی دونوں من جانب اللہ تھے۔ اس کے الفاظ کی ترتیب ہی نہیں، اس کی آیتوں کی ترتیب اور سورتوں کی ترتیب بھی خدا کی طرف سے تھی۔ اس کے الفاظ کو دوسرے الفاظ کے ساتھ بدلنا بھی جائز نہ تھا۔ اور وہ اس لیے نازل ہوا تھا کہ لوگ انہی الفاظ میں اسی ترتیب کے ساتھ اس کی تلاوت کریں۔ اس کے مقابلہ میں سنت کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ وہ محض لفظی نہ تھی بلکہ عملی بھی تھی۔ اور جو لفظی تھی اس کے الفاظ قرآن کے الفاظ کی طرح بذریعہ وحی نازل نہیں ہوتے تھے بلکہ حضورؐ نے اس کو اپنی زبان میں ادا کیا تھا۔ پھر اس کا ایک بڑا حصہ ایسا تھا جسے حضورؐ کے ہم عصروں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا تھا، مثلاً یہ کہ حضورؐ کے اخلاق ایسے تھے، حضورؐ کی زندگی ایسی تھی، اور نلاں موقع پر حضورؐ نے یوں عمل کیا۔ حضورؐ کے اقوال اور تقریریں نقل کرنے کے بارے میں بھی

یہ پابندی نہ تھی کہ سننے والے انہیں لفظ بلفظ نقل کریں، بلکہ اہل زبان سامعین کے لیے یہ جائز تھا اور وہ اس پر قادر بھی تھے کہ آپ کے ایک بات سن کر معنی و مفہوم بدلے بغیر اسے اپنے الفاظ میں بیان کر دیں حضور کے الفاظ کی تلاوت مقصود نہ تھی بلکہ اس تعلیم کی پیروی مقصود تھی جو آپ دی ہو۔ احادیث میں قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی طرح یہ ترتیب محفوظ کرنا بھی ضروری نہ تھا کہ فلاں حدیث پہلے ہو اور فلاں اس کے بعد، اس بنا پر احادیث کے معاملے میں یہ بالکل کافی تھا کہ لوگ انہیں یاد رکھیں اور دیانت کے ساتھ انہیں لوگوں تک پہنچائیں۔ ان کے معاملے میں کتابت کی وہ اہمیت نہ تھی جو قرآن کے معاملے میں تھی۔

دوسری بات جسے خوب سمجھ لینا چاہیے، یہ ہے کہ کسی چیز کے سند اور حجت ہونے کے لیے اس کا لکھا ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ اعتماد کی اصل بنیاد اس شخص یا ان اشخاص کا بھروسہ کے قابل ہونا ہے جس کے یا جن کے ذریعہ سے کوئی بات دوسروں تک پہنچے، خواہ وہ مکتوب ہو یا غیر مکتوب۔ خود قرآن کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لکھوا کر نہیں بھیجا بلکہ نبی کی زبان سے اس کو بندون تک پہنچایا۔ اللہ نے پورا انحصار اس بات پر کیا کہ جو لوگ نبی کو سچا مانیں گے وہ نبی کے اعتماد پر قرآن کو بھی ہمارا کلام مانیں گے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قرآن کی حقیقی تبلیغ و اشاعت کی زبانی ہی کی۔ آپ کے جو صحابہ مختلف علاقوں میں جا کر تبلیغ کرتے تھے وہ قرآن کی سورتیں لکھی ہوئی نہ لے جاتے تھے لکھی ہوئی آیات اور سورتیں تو اس تھیلے میں پڑی رہتی تھیں جس کے اندر آپ انہیں کتابان وحی سے لکھوا کر ڈال دیا کرتے تھے۔ باقی ساری تبلیغ و اشاعت زبان سے ہوتی تھی اور ایمان لانے والے اس ایک صحابی کے اعتماد پر یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ جو کچھ

دعاشیہ ۱۷ صفحہ سابقہ) حدیث کا یہ آخری ٹکڑا صاف بتا رہا ہے کہ کچھ منافقین نے ذہنیوں پر دست رازیاں کی ہونگی اور قرآن کا سہارا لیکر کہا ہو گا کہ تلو قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں داخل ہونے کے لیے بھی اجازت کی ضرورت ہے۔ اور قرآن میں کہاں ان کی عہدوں پر ہاتھ ڈالنے اور ان کے باغوں کے پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ © rasailojaraid.com

وہ سنا رہا ہے وہ خدا کا کلام ہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم وہ پہنچا رہا ہے وہ حضور ہی کا حکم ہے۔

تیسرا اہم نکتہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ کبھی جوئی چیز بجائے خود کبھی قابلِ اعتماد نہیں ہوتی جب تک کہ زندہ اور قابلِ اعتماد انسانوں کی شہادت اس کی توثیق نہ کرے محض لکھی ہوئی کوئی چیز اگر نہیں ملے اور ہم اصل لکھنے والے کا نہ پہچانتے ہوں، یا لکھنے والا خود نہ بتائے کہ یہ اسی کی تحریر ہے، یا ایسے شاہد موجود نہ ہوں جو اس امر کی تصدیق کریں کہ یہ تحریر اسی شخص کی ہے جس کی طرف منسوب کی گئی ہے، تو ہمارے لیے محض وہ تحریر یقینی کیا معنی ظنی محبت بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسی اصولی حقیقت ہے جسے موجودہ زمانے کا قانون شہادت بھی تسلیم کرتا ہے اور فاضل حج خود اپنی عدالت میں اس پر عمل فرماتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے محفوظ ہونے پر جو یقین ہم رکھتے ہیں کیا اس کی بنیاد یہی ہے کہ وہ لکھا گیا تھا۔ کاتبین وحی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے صحیفے جو حضورؐ نے امداد کرائے تھے آج دنیا میں نہیں موجود نہیں ہیں۔ اگر وہ موجود ہوتے بھی تو آج کون یہ تصدیق کرتا کہ یہ وہی صحیفے ہیں جو حضورؐ نے لکھوائے تھے۔ خود یہ بات بھی کہ حضورؐ اس قرآن کو نزولِ وحی کے ساتھ ہی لکھوا لیا کرتے تھے، زبانی روایات ہی سے معلوم ہوئی ہے، ورنہ اس کے جاننے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ پس قرآن کے محفوظ ہونے پر ہمارے یقین کی اصل وجہ اس کا لکھا ہوا ہونا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ زندہ انسان زندہ انسانوں سے مسلسل اس کو سنتے اور آگے زندہ انسانوں تک اسے پہنچاتے چلے آ رہے ہیں۔ لہذا یہ غلط خیال ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ کسی چیز کے محفوظ ہونے کی واحد سبیل بس اس کا لکھا ہوا ہونا ہے۔

ان امور پر اگر فاضل حج، اور ان کی طرح سوچنے والے حضرات غور فرمائیں تو انہیں یہ تسلیم کرنے میں انشاء اللہ کوئی زحمت نہ پیش آئے گی کہ اگر معتبر ذرائع سے کوئی چیز پہنچے تو وہ سند بخشنے کی پوری قابلیت رکھتی ہے۔ لکھنے نہ گئی ہو۔

کیا احادیثِ ہادی سو برس تک گم شدہ شمول میں پڑی رہیں؟ | پھر نکتہ نمبر ۴ کے آخر میں فاضل

جمع کا یہ ارشاد کہ احادیث نہ یاد کی گئیں نہ محفوظ کی گئیں بلکہ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں بھی پڑی رہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کر کے مگھے یہاں تک کہ ان کی وفات کے کئی سو برس بعد ان کو جمع اور مرتب کیا گیا، یہ نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے بلکہ حقیقت یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا اور آپ کے ساتھ ابتدائی دور کے مسلمانوں کی عقیدت کا بہت ہی حقیر اندازہ ہے۔ واقعات سے قطع نظر ایک شخص جس اپنی عقل ہی پر زور ڈال کر صحیح صورت حال کا تصور کرے تو وہ کبھی باور نہیں کر سکتا کہ جس عظیم الشان شخصیت نے عرب کے لوگوں کو اخلاق و تہذیب اور عقائد و اعمال کی انتہائی پستیوں سے نکال کر عذریں مقام تک پہنچا دیا تھا اُس کی باتوں اور اس کے کاموں کو وہی لوگ اس قدر ناقابلِ التفات سمجھتے تھے کہ انہوں نے اس کی کوئی بات یاد رکھنے کی کوشش نہ کی، نہ دوسروں کے سامنے اتفاقاً ذکر آ جانے سے بڑھ کر کبھی اس کا یہ جاننا، نہ بعد ان آنے والی نسروں سے اس کو کوئی اہمیت دی کہ اس کے دیکھنے والوں سے کبھی اس کے حالات پوچھتے۔ ایک معمولی لیڈرنگ سے جس کسی کو شرفِ صحبت نصیب ہو جاتا ہے تو وہ اس سے اپنی ملاقاتوں کی ایک ایک بات یاد رکھتا ہے اور دوسروں کے سامنے اس کا ذکر کرتا رہتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد نئی آنے والی نسروں کے لوگ جہاں اس کے ملنے والوں سے اس کے حالات دریافت کرتے ہیں۔ آخر جسٹس محمد شفیع صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا سمجھ لیا ہے کہ حضور کو آپ کے ہم عصر اور آپ کے متصل زمانے کے لوگ اتنے التفات کا بھی مستحق نہ سمجھتے تھے؟ اب ذرا اصل صورتِ واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے لیے ایک ایسے پیشوا تھے جن سے وہ ہر وقت عقائد اور عبادات اور اخلاق اور تہذیب و شائستگی کا سبق حاصل کرتے تھے۔ آپ کی زندگی کے ایک ایک رخ اور ایک ایک پہلو کو دیکھ کر وہ پاکیزہ انسانوں کی سبقت نہ سمجھ سکتے تھے۔ معلوم تھا کہ آپ کی بعثت سے

پہلے ہم کیا تھے اور آپ نے ہمیں کیا کچھ بنا دیا ہے۔ ان کے لیے ہر پیش آنے والے مسئلے میں مفتی بھی آپ ہی تھے اور قاضی بھی آپ۔ آپ ہی کی قیادت میں وہ لڑتے بھی تھے اور صلح بھی کرتے تھے۔ ان کو تجربہ تھا کہ اس قیادت کی پیروی میں خیم کہاں سے چلے تھے اور بالآخر کہاں پہنچ کر رہے۔ اس بنا پر وہ آپ کی ایک ایک بات کو یاد رکھتے تھے۔ جو قریب رہتے تھے وہ بالائزمام آپ کی صحبتوں میں بیٹھتے تھے جنہیں کسی وقت آپ کی مجلس سے غیر حاضر رہنا ہوتا تو وہ دوسروں سے پوچھ کر معلوم کرتے تھے کہ آج آپ نے کیا کیا اور کیا کہا۔ دُور دُور سے آنے والے لوگ اپنے اُن اوقات کو جو آپ کے ساتھ بسر ہو جاتے تھے اپنا حاصلِ زندگی سمجھتے تھے اور عمر بھر ان کی یاد دل سے نہ نکلتی تھی جنہیں حاضر ہونے کا موقع نصیب نہ ہوتا تھا وہ ہر اس شخص کے گرد اکٹھے ہو جاتے تھے جو آپ سے مل کر آتا تھا اور کرید کرید کر ایک ایک بات اس سے پوچھتے تھے۔ جنہوں نے آپ کو دُور سے کبھی دیکھا تھا یا کسی بُرے مجمع میں صرف آپ کی تقریر سن لی تھی وہ جیتنے جی اُس موقع کو نہ بھولتے تھے اور تجربہ اپنے اس شرف کو بیان کرتے تھے کہ ہماری آنکھوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور ہمارے کان آپ کی تقریر سُن چکے ہیں۔ پھر حضور کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئیں ان کے لیے تو دنیا میں سب سے اہم اگر کوئی چیز تھی تو وہ اس رسولِ عظیم کی سیرت تھی جس کی قیادت کے عجز سے نے عرب کے شتر بازوں کو اٹھا کر سندھ سے اسپین تک کا فرما نروا بنا دیا تھا۔ وہ ایک ایک ایسے شخص کے پاس پہنچتے تھے جس نے آپ کی صحبت پائی تھی۔ یا آپ کو کبھی دیکھا تھا، یا آپ کی کوئی تقریر سنی تھی۔ اور جوں جوں صحابہ دنیا سے اٹھنے چلے گئے، یہ اشتیاق بڑھتا گیا، حتیٰ کہ تابعین کے گروہ نے وہ سارا علم نچوڑ لیا جو سیرتِ پاک کے متعلق صحابہ سے ان کو مل سکتا تھا۔

صحابہ کی روایتِ حدیث عقل گواہی دیتی ہے کہ ایسا ضرور ہوا ہو گا اور تاریخ گواہی دیتی ہے کہ فی الواقع ایسا ہی ہوا ہے۔ آج حدیث کا جو علم دنیا میں موجود ہے وہ تقریباً دس ہزار صحابہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ © rasailojaraid.com

صحابیوں کے حالات بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ کس نے حضور کی کتنی صحبت پائی ہے یا کب اور کہاں آپ کو دیکھا ہے اور کن کن مواقع پر آپ کی خدمت میں حاضری کی ہے فاضل حج تو یہ فرماتے ہیں کہ احادیث ابتدائی دور کے مسلمانوں کے ذہن میں دفن پڑی رہی اور دو ڈھائی صدی بعد امام بخاری اور ان کے ہم عصروں نے انہیں کھود کر نکالا۔ لیکن تاریخ ہمارے سامنے جو نقشہ پیش کرتی ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ صحابہ میں سے تین حضرات نے سب سے زیادہ روایات بیان کی ہیں، ان کی اور ان کے مویات کی فہرست ملاحظہ ہو :

ابو ہریرہ متوفی ۳۵ھ ۱۰۰ احادیث کی تعداد ۵۳۰۴ (ان کے شاگردوں کی تعداد ۸۰۰ کے لگ بھگ تھی اور ان کے بکثرت شاگردوں نے ان کی احادیث کو قلمبند کیا تھا)

۱۱۷۰	ابو سعید خدری متوفی ۴۶ھ
۱۵۴۰	جابر بن عبد اللہ متوفی ۴۲ھ
۱۲۸۶	انس بن مالک متوفی ۹۳ھ
۲۲۱۰	امام ابو یوسف عاتقہ صدیقہ متوفیہ ۲۱۰ھ
۱۶۶۰	عبداللہ بن عباس متوفی ۶۸ھ
۱۶۳۰	عبداللہ بن عمر متوفی ۴۸ھ
۷۰۰	عبداللہ بن عمرو بن عاص متوفی ۶۲ھ
۸۴۸	عبداللہ بن مسعود متوفی ۳۲ھ

کیا یہ اسی بات کا ثبوت ہے کہ صحابہ کرام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو اپنے سینوں میں دفن کر کے یونہی اپنے ساتھ دنیا سے لے گئے ؟

دور صحابہ امام بخاری کے دور تک علم حدیث کی مسلسل تاریخ اس کے بعد ان تابعین کو دیکھیے جنہوں نے صحابہ کرام سے سیرت پر علم حاصل کیا۔ ان کی تعداد

کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف طبقات ابن سعد میں چند مرکزی شہروں کے جن تابعین کے حالات ملتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۴۸۴

مدینہ

۱۳۱

کوفہ

۴۱۳

کوفہ

۱۶۴

بصرہ

ان میں سے جن اکابر تابعین نے حدیث کے علم کو حاصل کرنے، محفوظ کرنے اور آگے پہنچانے کا سب سے بڑا کام کیا ہے وہ یہ ہیں:

وفات ۹۴ھ

پیدائش ۱۴ھ

سعید بن المسیب

۱۱۰ھ

۲۱ھ

حسن بصری

۱۱۰ھ

۲۲ھ

ابن سیرین

۹۴ھ

۲۲ھ

عروہ بن زبیر

(انہوں نے سیرت رسول پر پہلی کتاب لکھی)

وفات ۹۴ھ

پیدائش ۳۸ھ

علی بن حسین رضی اللہ عنہما

۱۰۴ھ

۲۱ھ

مجاہد

۱۰۶ھ

۳۴ھ

قاسم بن محمد بن ابی بکر

۶۸ھ

شہریار حضرت عمرؓ کے زمانے میں قاضی مقرر ہوئے

۶۲ھ

مسروق (حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں مدینہ آئے)

۷۵ھ

اسود بن یزید

۱۱۲ھ

کحول

۱۱۲ھ

رجاء بن حیوہ

ہمام بن منبہ پیدائش ۱۲۵۵ وفات ۱۳۱۵
 انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جو صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام
 سے آج بھی موجود ہے اور شائع ہو چکا ہے۔

سالم بن عبداللہ بن عمر	وفات ۱۳۱۵
نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر	۱۳۱۵
سعید بن جبیر	پیدائش ۱۲۵۵
سیدمان الاعمش	۱۳۶۱
ایوب السخیتی	۱۳۶۶
محمد بن المنکدر	۱۳۵۲
ابن شہاب زہری	۱۳۵۸

حدیث کا بہت بڑا تحریری ذخیرہ چھوڑا۔

سیدمان بن یسار	۱۳۳۲	وفات ۱۳۰۶
عکرمہ مولیٰ ابن عباس	۱۳۲۲	۱۳۰۵
عطاء بن ابی رباح	۱۳۲۶	۱۳۱۵
قتادہ بن دعائمہ	۱۳۶۱	۱۳۱۵
عامر الشعمی	۱۳۱۶	۱۳۰۵

عقلمند یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جوان تھے مگر حضور سے ملے نہیں۔

وفات ۱۳۶۲

ابراہیم نخعی	پیدائش ۱۳۶۶	۱۳۹۶
یزید بن ابی حبیب	۵۳	۱۳۸۸

ان حضرات کی تواریخ پیدائش و وفات پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی معلوم ہو جائے

کہ ان لوگوں نے صحابہ کے عہد کا بہت بڑا حصہ دیکھا ہے۔ ان میں سے بیشتر وہ تھے جنہوں نے صحابہ کے گھروں میں اور صحابیات کی گودوں میں پرورش پائی ہے، اور بعض وہ تھے جن کی عمر کسی نہ کسی صحابی کی خدمت میں بسر ہوئی ہے۔ ان کے حالات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک شخص نے بکثرت صحابہ سے مل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کیے ہیں اور آپ کے ارشادات اور فیصلوں کے متعلق وسیع واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ اسی وجہ سے روایت حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ انہی لوگوں سے بعد کی نسوں کو پہنچا ہے۔ تاوقتیکہ کوئی شخص یہ فیض نہ کرے کہ پہلی صدی ہجری کے تمام مسلمان منافق تھے، اس بات کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا کہ ان لوگوں نے گھر بیٹھے حدیثیں گھڑ لی ہوگی اور پھر بھی پوری امت نے انہیں سرانگمہوں پر بٹھایا ہوگا اور ان کو اپنے اکابر علماء میں شمار کیا ہوگا۔

اس کے بعد اصغر تابعین اور تبع تابعین کا وہ گروہ ہمارے سامنے آتا ہے جو ہزار ہا کی تعداد میں تمام دنیا سے اسلام میں پھیلا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے بہت بڑے پیمانے پر تابعین سے احادیث لیں اور دُور دُور کے سفر کر کے ایک ایک علاقے کے صحابہ اور ان کے شاگردوں کا علم جمع کیا۔ ان کی چند نمایاں شخصیتیں یہ ہیں :

حضر بن محمد بن علی، جعفر الصادق، پیدائش ۱۲۸ھ	وفات ۱۴۸ھ
ابو حنیفۃ النعمان، امام اعظم، ۸۰ھ	۱۵۰ھ
شعب بن الحجاج، ۸۳ھ	۱۶۰ھ
لیث بن سعد، ۹۳ھ	۱۶۵ھ
ربیعۃ الرازی، ۱۳۹ھ	۱۳۹ھ
سعید بن ابی عروبہ، ۱۵۶ھ	۱۵۶ھ
مسعر بن کدام، ۱۵۲ھ	۱۵۲ھ
عبد الرحمن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر، ۱۶۹ھ	۱۶۹ھ

سفیان الثوریؒ پیدائش ۹۷ھ وفات ۱۶۱ھ

حماد بن زیدؒ ۹۸ھ ۱۵۹ھ

دوسری صدی ہجری کے جامعین حدیث | یہی دور تھا جس میں حدیث کے مجموعے لکھنے اور مرتب کرنے کا کام باقاعدگی کے ساتھ شروع ہوا۔ اس زمانے میں جن لوگوں نے احادیث کے مجموعے مرتب کیے وہ حسب ذیل ہیں:

ربیع بن صبیحؒ وفات ۱۱۸ھ انہوں نے ایک ایک فقہی عنوان پر الگ الگ سائل مرتب کیے

سعید بن ابی عروبہؒ ۱۵۶ھ

موسیٰ بن عقیبہؒ ۱۶۱ھ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی تاریخ مرتب کی

امام مالکؒ پیدائش ۹۳ھ ۱۷۹ھ انہوں نے احکام شرعی کے متعلق احادیث و آثار کو جمع کیا

ابن جریرؒ ۱۵۶ھ ۲۵۵ھ

امام اوزاعیؒ ۱۵۶ھ ۲۵۵ھ

سفیان ثوریؒ ۹۷ھ ۱۶۱ھ

حماد بن سلمہ بن یارہؒ ۱۵۶ھ ۲۵۵ھ

امام ابو یوسفؒ ۱۵۶ھ ۲۵۵ھ

امام محمدؒ ۱۵۶ھ ۲۵۵ھ

محمد بن اسحاقؒ ۱۵۶ھ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک مرتب کی

ابن سعدؒ ۱۵۶ھ ۲۵۵ھ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے حالات جمع کیے

عبید اللہ بن موسیٰ البغویؒ ۲۱۳ھ انہوں نے ایک ایک صحابی کی روایات الگ الگ جمع کیں

مسدد بن مہر ہذا المہریؒ ۲۱۳ھ

اسد بن موسیٰؒ ۲۱۳ھ

نعیم بن حماد الخزازیؒ ۲۱۳ھ

امام احمد بن حنبل۔ پیدائش ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ انہوں نے ایک ایک صحابی کی روایات الگ الگ جمع کیں

اسحق بن راہویہ پیدائش ۱۶۱ھ وفات ۲۲۸ھ

عثمان بن ابی شیبہ پیدائش ۱۵۶ھ ۲۳۹ھ

ابو یوسف بن ابی شیبہ ۱۵۹ھ ۲۲۵ھ

انہوں نے فقہی ابواب اور صحابہ کی جداگانہ روایات دونوں کے لحاظ سے احادیث جمع کیں۔

ان میں سے امام مالک، امام ابو یوسف، امام محمد، محمد بن اسحاق، ابن سعد، امام احمد بن حنبل اور ابوبکر ابن ابی شیبہ کی کتابیں آج تک موجود ہیں اور شائع ہو چکی ہیں۔ نیز موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی کا ایک حصہ بھی شائع ہو چکا ہے اور جن حضرات کی کتابیں آج نہیں ملتیں وہ بھی درحقیقت ضائع نہیں ہوئی ہیں، بلکہ ان کا پورا مواد بخاری و مسلم اور ان کے ہم عصروں نے اور ان کے بعد آنے والوں نے اپنی کتابوں میں شامل کر لیا۔ اس لیے لوگ ان سے بے نیاز ہوتے چلے گئے۔

امام بخاری کے دوزخ علم حدیث کی اس مسلسل تاریخ کو دیکھنے کے بعد کوئی شخص فاضل حج کے ان اثرات کو آخر کیا وزن دے سکتا ہے کہ "احادیث نہ یاد کی گئیں نہ محفوظ کی گئیں بلکہ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کر کے مر گئے یہاں تک کہ ان کی وفات کے چند سو برس بعد ان کو جمع اور مرتب کیا گیا۔" اور یہ کہ "بعد میں پہلی مرتبہ رسول اللہ کے تقریباً ایک سو برس بعد احادیث کو جمع کیا گیا مگر ان کا ریکارڈ اب محفوظ نہیں ہے۔" اس موقع پر ہم یہ عرض کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ ہائی کورٹ جیسی بلند پایہ عدالت کے ججوں کو علمی مسائل پر اظہار خیال کرنے میں اس سے زیادہ متناظر و باخبر ہونا چاہیے۔

احادیث میں اختلاف کی حقیقت آگے حل کرنا ضل حج نے اپنے نکتہ ششم میں عاید

کے ”انتہائی مشکوک“ اور ناقابل اعتماد“ ہونے کی ایک وجہ یہ بیان فرماتی ہے کہ ”بہت کم احادیث ہیں جن میں یہ جامعین حدیث متفق ہیں“ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو سہ سہری طور پر چند مختلف احادیث پر ایک نگاہ ڈال کر تو کیا جاسکتا ہے لیکن اگر تفصیل کے ساتھ کتب حدیث کا مقابل مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان اتفاق بہت زیادہ اور اختلاف بہت کم ہے۔ پھر جن میں اختلاف ہے ان کا جائزہ لیا جائے تو زیادہ تر اختلافات حسب ذیل چار نوعیتوں میں سے کسی نوعیت کے پائے جاتے ہیں :

ایک یہ کہ مختلف راویوں نے ایک ہی بات یا واقعہ کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے اور ان کے درمیان معانی میں کوئی اہم اختلاف نہیں ہے یا مختلف راویوں نے ایک ہی واقعہ یا تقریر کے مختلف اجزاء نقل کیے ہیں۔

دوسرے یہ کہ خود حضور نے ایک مضمون کو مختلف الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔
تیسرے یہ کہ حضور نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے عمل فرمایا ہے۔
چوتھے یہ کہ ایک حدیث پہلے کی ہے اور دوسری حدیث بعد کی اور اس نے پہلی کو منسوخ کر دیا ہے۔

ان چار اقسام کو چھوڑ کر جن احادیث کا باہمی اختلاف رفع کرنے میں واقعی مشکل پیش آتی ہے ان کی تعداد پورے ذخیرہ حدیث میں ایک فی صدی سے بھی بہت کم ہے۔ یہ چند روایات ہیں اس خرابی کا پایا جانا یہ فیصلہ کر دینے کے لیے کافی ہے کہ پورا ذخیرہ حدیث مشکوک اور ناقابل اعتماد ہے ؟ روایات کسی ایک ناقابل تقسیم کل کا نام نہیں ہے جس کے کسی جزء کے ساقط ہونے سے کل کا ساقط ہو جانا لازم آئے۔ ہر روایت اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے اور اپنی جگہ کا سند کے ساتھ آتی ہے۔ اس بنا پر ایک دو نہیں، دو چار سو روایتوں کے ساقط ہونے سے بھی بقیہ روایات کا سقوط لازم نہیں آسکتا۔ علی تنقید پر جو جو روایات بھی پوری اتریں انہیں ماننا ہی ہوگا۔

محدثین کے درمیان اختلاف کی ایک اور صورت یہ ہے کہ کسی روایت کی سند کو ایک محدث اپنی تشدید کے اعتبار سے درست سمجھتا ہے اور دوسرا محدث اسے کمزور قرار دیتا ہے۔ یہ راستے اور محققین کا اختلاف ہے جس سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیا عدالتوں میں کسی شہادت کو قبول کرنے اور نہ قبول کرنے پر اختلاف کبھی نہیں ہوتا؟

کیا حافظہ سے نقل کی ہوئی روایات ناقابل اعتماد ہیں؟ اب ہمیں فاضل حج کے آخری دو مکتوبوں کو دینا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کے عربوں کا حافظہ جیسا کچھ قوی ہے پہلی صدی ہجری کے عربوں کا حافظہ بھی اتنا ہی قوی ہو گا۔ تاہم اسے خواہ کتنا ہی قوی مان لیا جائے، کیا صرف حافظہ سے نقل کی ہوئی باتیں قابل اعتماد سمجھی جاسکتی ہیں؟ پھر ان کا ارشاد ہے کہ ”ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچتے پہنچتے بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اور ہر ذہن کے اپنے خیالات اور تحسیات اس کو موڑتے توڑتے چلے جاتے ہیں“ یہ دو مزید وجہیں ہیں جن کی بنا پر وہ احادیث کو اعتماد و استناد کے قابل نہیں سمجھتے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہے۔ تجربے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آدمی اپنی جس قوت سے زیادہ کام لیتا ہے وہ ترقی کرتی ہے اور جس سے کم کام لیتا ہے وہ کمزور ہو جاتی ہے۔ یہ بات جس طرح تمام انسانی قوتوں کے معاملے میں صحیح ہے، حافظہ کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اہل عرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہزاروں برس سے اپنا کام تحریر سے بچائے یا اور حافظے سے چھلانے کے خواہ گئے۔ ان کے تاجر لاکھوں روپے کا لین دین کرتے تھے اور کوئی لکھا پڑھی نہ ہوتی تھی۔ پانی پانی کا حساب، اور بیسیوں گناہوں کا تفصیلی حساب وہ فوک زبان پر رکھتے تھے۔ ان کی قبائلی زندگی میں نسب اور خونی رشتوں کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ سب کچھ بھی حافظے میں محفوظ رہتا اور زبانی روایت سے ایک نسل کے بعد دوسری نسل تک پہنچتا تھا۔ ان کا سارا لٹریچر بھی کاغذ پر نہیں بلکہ لوحِ قلب پر لکھا ہوا تھا۔ ان کی یہی عادت تحریر کا رواج ہو جانے کے بعد بھی تقریباً ایک صدی تک جاری رہا۔ © rasailojaraid.com

ہی بدلتی ہیں۔ وہ کاغذ کی تحریر پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنے حلقے پر اعتماد کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ انہیں اس پر فخر تھا، اور ان کی نگاہ سے وہ شخص گرجاتا تھا جس سے کوئی بات پوچھی جاسے اور وہ زبانی بتانے کے بجائے گھر سے کتاب ہاگراس کا جواب دے۔ ایک مدت دراز تک وہ لکھنے کے باوجود یاد کرتے تھے اور تحریر پڑھ کر سنانے کے بجائے لوگ زبان سے سنانا نہ صرف باعث عزت سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک آدمی کے علم پر اعتماد بھی اسی طریقے سے قائم ہوتا تھا۔

کوئی وجہ نہیں کہ حلقے کی یہ کیفیت آج کے عربوں میں باقی رہے۔ صدیوں سے کتب پر اعتماد کرتے رہنے اور حلقے سے کام کم لینے کے باعث اب کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کی یادداشت قدیم عربوں کی سی رہ جاتے۔ لیکن عربوں اور غیر عربوں، سب میں آج بھی اس امر کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ ان پڑھ لوگ اور اندھے آدمی پڑھے لکھے اور بنیاد انسانوں کی بہ نسبت زیادہ یادداشت رکھتے ہیں۔ ناخواندہ تاجروں میں بکثرت لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں جنہیں بہت سے گاہکوں کے ساتھ پناہنر ہاروپے کا لین دین پوری تفصیل کے ساتھ یاد رہتا ہے۔ بے شمار اندھے ایسے موجود ہیں جن کی قوت حافظہ آدمی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ تحریر پر اعتماد کر لینے کے بعد ایک قوم کے حافظے کی وہ حالت باقی نہیں رہ سکتی جو ناخواندگی کے دور میں اس کی تھی۔

احادیث کے محفوظ رہنے کی اصل علت یہ اس معاملے کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ صحابہ کے لیے خاص طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو ٹھیک ٹھیک یاد رکھنے اور انہیں صیح صیح بیان کرنے کے کچھ مزید محرکات بھی تھے جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا :-

اولاً، وہ سچے دل سے آپ کو خدا کا نبی، اور دنیا کا سب سے بڑا انسان سمجھتے تھے۔ ان کے دلوں پر آپ کی شخصیت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ان کے لیے آپ کی بات اور آپ کے واقعات حالات کی حیثیت عام انسانی وقائع جیسی نہ تھی کہ وہ ان کو اپنے معمولی حافظے کے حوصلے کو دیتے۔

ان کے لیے تو ایک ایک لمحہ جو انہوں نے آپ کی معیت میں گزارا، ان کی زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی لمحہ تھا اور اس کی یاد کو وہ اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔

ثانیاً، وہ آپ کی ایک ایک تقریر، ایک ایک گفتگو، اور آپ کی زندگی کے ایک ایک عمل سے وہ علم حاصل کر رہے تھے جو انہیں اس سے پہلے کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔ وہ خود جانتے تھے کہ ہم اس سے پہلے سخت جاہل اور گمراہ تھے، اور یہ پاکیزہ ترین انسان اب ہم کو صحیح علم دے رہا ہے اور مہذب انسان کی طرح جینا سکھا رہا ہے۔ اس لیے وہ پوری توجہ کے ساتھ ہر بات سنتے اور ہر فعل نو دیکھتے تھے، کیونکہ انہیں اپنی زندگی میں عملاً اسی کا نقش پیوست کرنا تھا، اسی کی نقل اتارنی تھی، اور اسی کی رہنمائی میں کام کرنا تھا۔ ملاحظہ رہے کہ اس شعور و احساں کے ساتھ آدمی جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے اسے یاد رکھنے میں وہ اتنا سہل انگار نہیں ہو سکتا جتنا وہ کسی میسے یا کسی بازار میں سنی اور دیکھی ہوئی باتیں یاد رکھنے میں ہو سکتا ہے۔

ثالثاً، وہ قرآن کی رو سے بھی سمجھتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بار بار متنبہ کرنے سے بھی ان کو شدت کے ساتھ اس بات کا احساس تھا کہ خدا کے نبی پر افترا کرنا بہت بڑا گناہ ہے جس کی سزا ابدی جہنم ہوگی۔ اس بنا پر وہ حضور کی طرف منسوب کئے گئے کوئی بات بیان کرنے میں سخت محتاط تھے۔ صحابہ کرام میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی صحابی نے اپنی کسی ذاتی عرض سے یا اپنا کوئی کام نکالنے کے لیے حضور کے نام سے کبھی ناجائز فائدہ اٹھایا ہو۔ حتیٰ کہ ان کے درمیان جب اختلافات برپا ہوئے اور دو خونریز لڑائیاں تک ہو گئیں، اس وقت بھی فریقین میں سے کسی ایک شخص نے بھی کوئی حدیث گھر کر دوسرے کے خلاف استعمال نہیں کی۔ اس قسم کی حیثیت بعد کے ناخدا نامہ میں لوگوں نے تو ضرور تصنیف کیں۔ مگر صحابہ کے واقعات میں اس کی مثال ناپید ہے۔

رابعاً وہ اپنے اوپر اس بات کی بہت بڑی ذمہ داری محسوس کرتے تھے کہ بعد کے آنے والوں کو حضور کے حالات اور آپ کی مداخلات و تعلیمات بالکل صحیح صورت میں پہنچائیں اور اس

میں کسی قسم کا مبالغہ یا آمیزش نہ کریں، کیونکہ ان کے نزدیک یہ دین تھا اور اس میں اپنی طرف سے تغیر نہ دینا کوئی معمولی جرم نہیں بلکہ ایک عظیم خیانت تھا۔ اسی وجہ سے صحابہ کے حالات میں اس قسم کے بکثرت واقعات ملتے ہیں کہ حدیث بیان کرتے ہوئے وہ کانپ جاتے تھے، ان کے چہرہ کا رنگ اڑ جاتا تھا، جہاں ذرہ برابر بھی خدشہ ہوتا تھا کہ شاید حضور کے الفاظ کچھ اور ہوں وہاں بات نقل کر کے اوکھا قال کہہ دیتے تھے تاکہ سننے والا ان کے الفاظ کو بعینہ حضور کے الفاظ نہ سمجھ لے۔

خامساً۔ اکابر صحابہ خاص طویر پر عام صحابیوں کو احادیث روایت کرنے میں احتیاط کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ اس معاملے میں سہل انگاری برتنے سے شدت کے ساتھ روکتے تھے اور بعض اوقات ان سے حضور کا کوئی ارشاد سن کر شہادت طلب کرتے تھے تاکہ یہ اطمینان ہو جائے کہ دوسروں نے بھی یہ بات سنی ہے۔ اسی اطمینان کے لیے صحابیوں نے ایک دوسرے کے حافظے کا امتحان بھی لیا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ حضرت عائشہ کو حج کے موقع پر حضرت عبد اللہ بن عمر بن عاص ایک حدیث پہنچی۔ دوسرے سال حج میں ام مومنین نے پھر اسی حدیث کو دریافت کرنے کے لیے ان کے پاس آدمی بھیجا۔ دونوں مرتبہ حضرت عبد اللہ کے بیان میں ایک حرف کا فرق بھی نہ تھا۔ اس پر حضرت عائشہ نے فرمایا واقعی عبد اللہ کو بات ٹھیک یاد ہے (بخاری و مسلم)۔

سادساً، حضور کی ہدایات و تعلیمات کا بہت بڑا حصہ وہ تھا جس کی حیثیت محض زبانی روایات ہی کی نہ تھی، بلکہ صحابہ کے معاشرے میں، ان کی شخصی زندگیوں میں، ان کے گھروں میں، ان کی معیشت اور حکومت اور عدالت میں اس کا پورا اٹھتے بگا ہوا تھا جس کے آثار و نقوش ہر طرف لوگوں کو چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ ایسی ایک چیز کے متعلق کوئی شخص حلقے کی غلطی، یا اپنے ذاتی خیالات و تفسیلات کی بنا پر کوئی زالی بات لا کر پیش کرنا بھی تو وہ چل کہاں سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی زالی حدیث آئی بھی ہے تو وہ الگ پہچان لی گئی

ہے اور محدثین نے اس کی نشان دہی کر دی ہے کہ اس خاص راوی کے سوا یہ بات کسی اور نے بیان نہیں کی ہے۔ یا اس پر عمل درآمد کی کوئی تفسیر نہیں ملتی ۱۰۔

احادیث کی صحت کا ایک اہم ثبوت | ان سب کے علاوہ ایک نہایت اہم بات اور بھی ہے جسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عربی زبان جانتے ہیں اور جنہوں نے محض سرسری طور پر کبھی کبھار متفرق احادیث کا مطالعہ نہیں کر لیا ہے بلکہ گہری نگاہ سے حدیث کی پوری پوری کتابوں کو یا کم از کم کسی ایک ہی کتاب (مثلاً بخاری یا مسلم) کو از اول تا آخر پڑھا ہے۔ ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ایک خاص زبان اور آپ کو اپنا ایک مخصوص انداز بیان ہے جو تمام صحیح احادیث میں بالکل یکسانیت اور یک رنگی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ قرآن کی طرح آپ کا لہجہ اور اسٹائل اپنی ایسی انفرادیت رکھتا ہے کہ اس کی نقل کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔ اس میں آپ کی شخصیت بدلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں آپ کا بند منصب و مقام جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے آدمی کا دل یہ گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ باتیں محمد رسول اللہ کے سوا کوئی دوسرا شخص کہہ نہیں سکتا۔ جن لوگوں نے کثرت سے احادیث کو پڑھا ہے حضور کی زبان اور طرز بیان کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے وہ حدیث کی سند کو دیکھے بغیر محض متن کو پڑھا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا موضوع، کیونکہ موضوع کی زبان ہی بتا دیتی ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان نہیں ہے جنہی کہ صحیح احادیث تک میں روایت باللفظ اور روایت بالمعنی کا فرق صاف محسوس ہو جاتا ہے، کیونکہ جہاں راوی نے حضور کی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے وہاں آپ کے اسٹائل سے واقفیت رکھنے والا یہ بات پالیتا ہے کہ یہ خیال اور بیان تو حضور ہی کا ہے لیکن زبان میں فرق ہے۔ یہ انفرادی خصوصیت احادیث میں کبھی نہ پائی جاسکتی اگر بہت سے کمزور حافظوں نے ان کو غلط طریقوں سے نقل کیا ہوتا اور بہت سے ذہنوں کی کار فرمائی نے ان کو اپنے خیالات و تعصبات کے مطابق توڑا مروڑا ہوتا کیا یہ بات عقل میں سمجھتی ہے کہ ہمیشہ سے ذہن مل کر ایک یک رنگ

لٹریچر اور ایک انفرادی اسٹائل پیدا کر سکتے ہیں؟

اور یہ معاملہ صرف زبانِ ادب کی حد تک ہی نہیں ہے، اس آگے بڑھ کر دیکھیے تو نظر آتا ہے کہ طہارت جسم لباس سے لے کر صلح و جنگ اور بین الاقوامی معاملات تک زندگی تمام مختلف شعبوں میں اور ایمان اخلاق سے لیکر علاماتِ قیامت اور حوالِ آخرت تک تمام فکری اور عقائدی مسائل میں صحیح احادیث ایک ایسا نظام فکر و عمل پیش کرتی ہیں جو اول سے آخر تک اپنا ایک ہی مزاج رکھتا ہے اور جس تمام خزاہیں پورا پورا منطقی ربط ہے۔ ایسا مربوط اور ہم رنگ نظام اور اتنا مکمل و حدائی نظام لازماً ایک ہی فکر سے بن سکتا ہے، بہت سے مختلف ذہن مل کر اسے نہیں بنا سکتے۔ یہ ایک اور اہم ذریعہ ہے جس سے موضوع احادیث ہی نہیں مشکوک احادیث تک پہچانی جاتی ہیں۔ سند کو دیکھنے سے پہلے ایک بصیرت رکھنے والا آدمی اس طرح کی کسی حدیث کے مضمون ہی کو دیکھ کر یہ بات صاف محسوس کر لیتا ہے کہ صحیح احادیث اور قرآن مجید نے مل کر اسلام کا جو نظام فکر اور نظام حیات بنایا ہے اس کے اندر یہ مضمون کسی ٹھیک نہیں بیٹھتا کیونکہ اس کا مزاج پورے نظام کے مزاج سے مختلف نظر آتا ہے۔

ان ختالی کی روشنی میں دیکھا جائے تو فاضل حج کی یہ باتیں بڑے ہی سرسری مطالعے اور نہایت نا کافی غور و تحقیق کا نتیجہ نظر آتی ہے کہ حدیث کو حافظوں کی غلطی اور مختلف ذہنوں کی کار فرمائی نے مسخ کر دیا ہے۔

چند احادیث پر فاضل حج کے اعتراضات | آگے چل کر فاضل حج فرماتے ہیں کہ احادیث کے مجموعوں میں ایسی حدیثیں بھی موجود ہیں جن کو صحیح ماننا سخت مشکل ہے اس کے لیے مثال کے طور پر وہ ۱۲ حدیثیں مشکوٰۃ کے اس انگریزی ترجمے سے نقل فرماتے ہیں جو الحاج مولوی فضل الکریم صاحب ایم اے بی ایل نے کیا ہے اور کلمتہ سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے قبل اس کے کہ ہم ان احادیث پر محترم حج صاحب کے اعتراضات کے بارے میں کچھ عرض کریں، ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ مشکوٰۃ کے اس ترجمے میں مترجم نے ایسی فاش غلطیاں کی ہیں جو عظیم حدیث ہی سے نہیں، عربی زبان سے بھی ان کی ناواقفیت کا ثبوت دیتی ہیں اور بد قسمتی سے فاضل حج نے ان تمام غلطیوں سمیت اس کی عبارتیں نقل

کہہ دی ہیں۔ اگرچہ اس کا مسئلہ زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن ہم یہاں صرف اس بات کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس معاملے کا ذکر کرتے ہیں کہ پاکستان اس وقت دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست ہے۔ اس کی عدالت عالیہ کے ایک فیصلے میں حدیث کی قانونی حیثیت پر اس قدر دُور رس بحث کی جائے اور پھر حدیث کے علم و فن سے اتنی سرسری، بلکہ ناقص واقفیت کا کھلا کھلا ثبوت ہم پہنچایا جائے۔ یہ چیز آخر دنیا کے اہل علم پر کیا اثر ڈالے گی اور ہماری عدالتوں کے وقار میں کیا اضافہ کرے گی؟ مثال کے طور پر پہلی ہی حدیث کے دو فقرے ملاحظہ ہوں وہی شانہ لہر مکن عجبا کا ترجمہ ”اور اس سے زیادہ عجیب بات اور کیا ہو سکتی ہے“ کیا گیا ہے، حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے: ”اُن کی کونسی بات عجیب نہ تھی؟“ ذرِ بِنِیْ اَتَعْبُدُ لِسُورِجِ کو مترجم نے ذرِ بِنِیْ اَتَعْبُدُ لَوِجِ پڑھا اور اگلے ترجمہ یوں کر دیا ”چھوڑ دے مجھ کو، کیا تو میرے رب کی عبادت کرے گی؟“ حالانکہ صرف یہ ترجمہ ہی مہمل نہیں ہے بلکہ اصل عبارت کو پڑھنے میں مترجم نے وہ غلطی کی ہے جو عربی گرامر کی اس حد سے واقفیت رکھنے والا آدمی بھی نہیں کر سکتا۔ تَعْبُدُ صِیغہ مذکر ہے اور سیاق عبارت بتا رہا ہے کہ مخاطب عورت ہے۔ عورت کو خطاب کر کے تَعْبُدُ کہا جاتا نہ کہ تَعْبُدُ۔ صحیح ترجمہ اس فقرے کا یہ ہے کہ ”مجھے چھوڑ دے تاکہ میں اپنے رب کی عبادت کروں“ اس طرح کی غلطیوں کو دیکھ کر آخر کو کون صاحبِ علم یہ باور کرے گا کہ فاضل حج حدیث کے علم میں کم از کم اتنا درک رکھتے ہیں جتنا کسی فن پر ماہرانہ رائے دینے کیلئے ناگزیر ہے۔ بعض احادیث میں عُمایں مضامین کیوں ہیں؟ اب ہم اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پیرا گراف ۷۶ میں فاضل حج یکے بعد دیگرے ۵ حدیثیں نقل کرتے چلے گئے ہیں اور کسی جگہ انھوں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ کس حدیث کے مضمون پر انہیں کیا اعتراض ہے۔ البتہ پیرا گراف ۷۷ میں وہ اختصار کے ساتھ اس خیال کا اظہار فرماتے ہیں کہ ان احادیث میں جو عربیائی پائی جاتی ہے اس کی بنا پر وہ یہ باور نہیں کر سکتے کہ واقعی یہ احادیث سچی ہوں گی۔ عالمیّا ان کا خیال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خواتین کے درمیان اور پھر ازواجِ مطہرات اور ان کے شاگردوں کے درمیان ایسی مکمل مکمل گفتگو آخر کیسے ہو سکتی تھی۔ اس سلسلے میں فاضل حج کی حدیث پر فرداً فرداً کلام کرنے سے پہلے

چند اصولی باتیں بیان کر دینی ضروری ہیں، کیونکہ موجود زمانے کے ”تعلیم یافتہ“ اصحاب باعموم انہی باتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اس طرح کی احادیث پر الجھتے ہیں۔

اول یہ کہ انسان کی داخلی زندگی کے چند گوشے ایسے ہیں جن کے متعلق اس کو ضروری تعلیم و تربیت اور ہدایات دینے میں شرم کا بے جا احساس اکثر مانع ہوتا رہا ہے، اور اسی وجہ سے اعلیٰ ترقی یافتہ قومیں تک ان کے بارے میں طہارت و نظافت کے ابتدائی اصولوں تک سے ناواقف رہی ہیں۔ شریعت الہی کا یہ احسان ہے کہ اس نے ان گوشوں کے بارے میں بھی ہم کو ہدایات دیں اور ان کے متعلق قواعد و ضوابط تاکہ ہمیں غلطیوں سے بچایا۔ غیر قوموں کے صاحب فکر لوگ اس چیز کی قدر کرتے ہیں، کیونکہ ان کی قومیں اس خاص شعبہ زندگی کی تعلیم و تربیت سے محروم ہیں مگر مسلمان جن کو گھر بیٹھے یہ ضابطے مل گئے، آج اس تعلیم کی ناقدری کر رہے ہیں، اور عجیب لطیفہ ہے کہ اس ناقدری کے اظہار میں وہ لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں جو اہل مغرب کی تقلید میں SEX-EDUCATION تک مدارس میں رائج کرنے کے قائل ہیں۔

دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس نبی پاک کو ہماری تعلیم کے لیے مامور فرمایا تھا اسی کے ذمہ یہ خدمت بھی کی تھی کہ اس خاص شعبہ زندگی کی تعلیم و تربیت بھی ہمیں دے۔ اہل عرب اس معاملہ میں ابتدائی ضابطوں تک سے ناواقف تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو۔ ان کے مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی۔ طہارت، استنجار اور غسل وغیرہ کے مسائل، نیز ایسے ہی دوسرے مسائل نہ صرف زبان سے سمجھائے، بلکہ اپنی ازواج مطہرات کو بھی اجازت دی کہ آپ کی خانگی زندگی کے ان گوشوں کو بے نقاب کریں اور عام لوگوں کو بتائیں کہ حضور خود کن ضابطوں پر عمل فرماتے تھے۔

سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسی ضرورت کی خاطر حضور کی ازواج مطہرات کو مؤمنین کے لیے ماں کا درجہ عطا فرمایا تھا تاکہ مسلمان ان کی خدمت میں حاضر ہو کر زندگی کے ان گوشوں کے متعلق رہنمائی حاصل کر سکیں اور جانیں میں ان مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کسی قسم کے ناپاک جذبہ کی دخل اندازی کا خطرہ نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کے پورے ذخیرہ میں کوئی ایک نظر بھی اس

بات کی نہیں ملتی کہ جو باتیں اہمات المؤمنین سے پوچھی گئی ہیں وہ خلفائے راشدین یا دوسرے صحابیوں کی بیگیاں سے بھی کبھی پوچھی گئی ہوں اور انہوں نے مردوں سے اس نوعیت کی گفتگو کی ہو۔ چہاں یہ کہ لوگ اپنے گمان سے، یا یہود و نصاریٰ کے اثر سے جن چیزوں کو حرام یا مکروہ اور ناپسندیدہ سمجھ بیٹھے تھے، اُن کے متعلق صرف یہ سن کر اُن کا اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ شریعت میں وہ حجاز ہیں۔ حکم حجاز کے باوجود ان کے دلوں میں یہ شک باقی رہتا تھا کہ شاید یہ کراہت سے خالی نہ ہو اس لیے وہ اپنے اطمینان کی خاطر یہ معلوم کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ حضورؐ کا اپنا طرز عمل کیا تھا۔ جب وہ یہ جان لیتے تھے کہ حضورؐ نے خود فلاں عمل کیا ہے تب ان کے دلوں سے کراہت کا خیال نکل جاتا تھا، کیونکہ وہ حضورؐ کو ایک مثالی انسان سمجھتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ جو کام آپؐ نے کیا ہو وہ مکروہ یا پاپیہ تھا بہت سے گراؤ نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک اہم وجہ ہے جس کی بنا پر ازوجِ مطہرات کو حضورؐ کی خانگی زندگی کے بعض ایسے معاملات کو بیان کرنا پڑا جو دوسری خواتین بیان کر سکتی ہیں، نہ ان کو بیان کرنا چاہیے۔

پنجم یہ کہ احادیث کا یہ حقیقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کی نبوت کے بڑے اہم شواہد میں شمار کرنے کے لائق ہے محمد رسول اللہ کے سوا دنیا میں کون یہ ہمت کر سکتا تھا، اور پوری تاریخ انسانی میں کس نے یہ ہمت کی ہے کہ ۳۰ سال تک شب و روز کے ہر لمحے اپنے آپ کو منظر عام پر رکھ دے، اپنی پراسٹیوٹ زندگی کو بھی پبلک بنا دے، اور اپنی بیویوں تک کو اجازت دے دے کہ میری گھر کی زندگی کا حال سب لوگوں کو صاف صاف بتا دو۔

اعراضاً کا تفصیلی جائزہ | ان امور کو نگاہ میں رکھ کر فرداً فرداً ان احادیث کو ملاحظہ فرمائیے جو فاضل حج نے پیش کی ہیں۔

پہلی حدیث میں حضرت عائشہؓ دراصل یہ بتانا چاہتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پہانیت سے بالکل دور تھے، اور اپنی بیویوں سے وہی ربط و تعلق رکھتے تھے جو دنیا کے ہر شوہر کا اپنی بیوی سے ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے اس کا ایسا گہرا تعلق تھا کہ بہترین بیوی

کے ساتھ لیٹ جانے کے بعد بھی بسا اوقات یکایک آپ پر عبادت کا شوق غالب آجاتا تھا اور آپ دنیا کا لطف و عیش چھوڑ کر اس طرح اٹھ جاتے تھے کہ گویا آپ کو خدا کی بندگی کے سوا کسی چیز دلچسپی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا یہ مخفی گوشہ آپ کی اہلیہ کے سوا اور کون بتا سکتا تھا؟ اور اگر یہ روشنی میں نہ آتا تو آپ کے اخلاص اللہ کی صحیح کیفیت دنیا کیسے جانتی؟ مجلس وعظ میں خدا کی محبت اور خشیت کا مظاہرہ کون نہیں کرتا۔ سچی اور گہری محبت و خشیت کا حال تو اسی وقت لکھتا ہے جب معلوم ہو کہ گوشہ تنہائی میں آدمی کا رنگ زندگی کیا ہوتا ہے۔

دوسری حدیث میں اصل بتانے کا مقصود یہ ہے کہ بوسہ بچائے خود وضو توڑنے والی چیز نہیں ہے جب تک کہ غائبہ جذبات سے کوئی رطوبت خارج نہ ہو جائے۔ عام طور پر لوگ خود بوسے ہی کو ناقض وضو سمجھتے تھے۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ اس سے اگر وضو ٹوٹتا نہیں ہے تو کم از کم تلہارت میں فرق ضرور آجاتا ہے۔ حضرت عائشہ کو ان کا شک دور کرنے کے لیے یہ بتانا پڑا کہ حضور نے خود اس کے بعد وضو کیے بغیر نماز پڑھی ہے۔ یہ مسئلہ دوسرے لوگوں کے لیے چاہے کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو، مگر جنہیں نماز پڑھنی ہو ان کو تو یہ معلوم ہونے کی بہر حال ضرورت ہے کہ کس حالت میں وہ نماز پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں اور کس حالت میں نہیں ہوتے۔

تیسری حدیث میں ایک خاتون کو اس مسئلے سے سابقہ پیش آجاتا ہے کہ اگر ایک عورت اسی طرح کا خواب دیکھے جیسا عام طور پر بالغ مرد دیکھا کرتے ہیں تو وہ کیا کرے۔ یہ صورت چونکہ عورتوں کو بہت کم پیش آتی ہے اس لیے عورتیں اس کے شرعی حکم سے ناواقف تھیں۔ ان خاتون نے جاکر مسئلہ پوچھ لیا اور حضور نے یہ بتا کر کہ عورت کو بھی مرد ہی کی طرح غسل کرنا چاہیے، صرف ان کو بلکہ تمام عورتوں کو ایک ضروری تعلیم دے دی۔ اس پر اگر کسی کو اعتراض ہے تو گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ عورتیں اپنی زندگی کے مسائل کس سے نہ پوچھیں اور شرم کے مارے خود ہی جو کچھ اپنی سمجھ میں آئے کرتی رہیں۔ رہا حدیث کا دوسرا ٹکڑا تو اس میں ایک خاتون کے اظہار تعجب پر حضور نے یہ علمی حقیقت بیان فرمائی ہے۔

سے ہوتا ہے، اولاد ان دونوں کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے، اور دونوں میں سے جس کا نطفہ بھی غالب رہتا ہے بچے میں اسی کی خصوصیات زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ اس حدیث کی جو تفصیلات بخاری و مسلم کے مختلف ابواب میں آتی ہیں ان کو ملا کر دیکھیے۔ ایک روایت میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں: وہل یكون الشبه الا من قبل ذالک؛ اذا علا ماء الرجل ماء الرجل شبه الولد اخواله واذا علا ماء الرجل ماءها شبه الولد انعماء۔
 ”اور کیا اولاد کی مشابہت اس کے سوا کسی اور وجہ سے ہوتی ہے؟ جب عورت کا نطفہ مرد کے نطفے پر غالب رہتا ہے تو بچہ تنہیال پر جاتا ہے اور جب مرد کا نطفہ اس کے نطفے پر غالب رہتا ہے تو بچہ ودھیال پر جاتا ہے۔“ منکرین حدیث نے جہالت یا شرارت سے ان احادیث کو یہ معنی پہناتے ہیں کہ مجامعت میں اگر مرد کا انزال عورت سے پہلے ہو تو بچہ باپ پر جاتا ہے ورنہ ماں پر۔ ہم اس ملک کی حالت پر حیران ہیں کہ یہاں جہلاء اور اشرار علانیہ اس قسم کی علمی و غیبازی کر رہے ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تک تحقیق کے بغیر اس سے متاثر ہو کر اس غلط فہمی میں پڑ رہے ہیں کہ احادیث ناقابلِ یقین باتوں سے لبریز ہیں۔

چوتھی حدیث میں حضرت عائشہؓ نے یہ بتایا ہے کہ زوجین ایک ساتھ غسل کر سکتے ہیں اور حضورؐ نے خود ایسا کیا ہے۔ اس مسئلے کے معلوم کرنے کی ضرورت دراصل ان لوگوں کو پیش آئی، حقیقی جن کے ہاں بیویاں اور شوہر سب نماز کے پابند تھے۔ فجر کے وقت ان کو بارہا اس صورت حال سے سابقہ پیش آتا تھا کہ وقت کی تنگی کے باعث یکے بعد دیگرے غسل کرنے سے ایک کی جہالت چھوٹ جاتی تھی۔ ایسی حالت میں ان کو یہ بتانا ضروری تھا کہ دونوں کا ایک ساتھ غسل کر لینا نہ صرف جائز ہے بلکہ اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ مدینے میں اُس وقت بجلی کی روشنی والے غسل خانے نہیں تھے اور فجر کی نماز اس زمانے میں اول وقت ہوا کرتی تھی، اور عورتیں بھی صبح اور عشا کی نمازوں میں مسجد جایا کرتی تھیں۔ ان باتوں کو نگاہ میں رکھ کر ہمیں بتایا جاتے کہ اس حدیث میں کیا پیرائے کے لائق نہیں ہے۔

پانچویں حدیث میں حضرت عائشہؓ نے بتایا ہے کہ خواب سے غسل کس حالت میں واجب ہوتا ہے اور کس حالت میں واجب نہیں ہوتا۔ اور چھٹی حدیث میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ بیداری کی حالت میں غسل کب واجب ہو جاتا ہے۔ ان دونوں حدیثوں کو آدمی اُس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھ سکتا تب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ وجوبِ غسل کے معاملہ میں اُس وقت صحابہ کرام اور تابعین کے درمیان ایک اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ بعض صحابہ اور ان کے شاگرد اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ غسل صرف اس وقت واجب ہوتا ہے جب مادہ خارج ہو۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے حضرت عائشہؓ کو یہ بتانا پڑا کہ یہ حکم صرف خواب کی حالت کے لیے ہے، بیداری میں مجرد دخول موجبِ غسل ہو جاتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل اسی طریقے پر تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ نماز پڑھنے والوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا، کیونکہ جو شخص صرف خروجِ مادہ پر غسل واجب ہونے کا قائل ہوتا وہ مباشرت بلا اخراجِ مادہ کے بعد نماز پڑھنے کی غلطی کر سکتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل بتانے ہی سے اس مسئلے کا قطعی فیصلہ ہوا۔

احادیث نمبر ۷-۸-۹-۱۰ اور ۱۱ کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ جنابت اور

حیض کی حالت میں انسان کے ناپاک ہونے کا تصور قدیم شریعتوں میں بھی تھا اور شریعتِ محمدیہ میں بھی پیش کیا گیا۔ لیکن قدیم شریعتوں میں یہودیوں اور عیسائی رابہوں کی مبالغہ آرائیوں نے اس تصور کو حدِ اعتدال سے آنا بڑھا دیا تھا کہ وہ اس حالت میں انسان کے وجود ہی کو ناپاک سمجھنے لگے تھے، اور ان کے اثر سے حجاز کے، اور خصوصاً مدینے کے باشندوں میں بھی یہ تصور حدِ مبالغہ کو پہنچ گیا تھا۔ خصوصاً حائضہ عورت کا تو اُس معاشرے میں گویا پورا مقاطعہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اسی کتاب مشکوٰۃ میں جس سے فاضل جج نے یہ احادیث نقل کی ہیں، باب الحيض کی پہلی حدیث یہ ہے کہ جب عورت کو حیض آتا تھا تو یہودی اس کے ساتھ کھانا پینا اور اس کے ساتھ رہنا سہنا چھو دیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتایا کہ اس حالت میں صرف فعلِ مباشرت ناجائز ہے، باقی ساری معاشرت اسی طرح رہنی چاہیے جیسی عام حالت میں ہوتی ہے، لیکن اس کے

باوجود ایک مدت تک لوگوں میں قدیم تعصبات باقی رہے اور لوگ یہ سمجھتے رہے کہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کا وجود کچھ نہ کچھ گندا تو رہتا ہی ہے، اور اس حالت میں اس کا ہاتھ جس چیز کو ٹنگ جاتے وہ بھی کم از کم مکروہ تو ضرور ہو جاتی ہے۔ ان تصورات کو اعتدال پر لانے کے لیے حضرت عائشہ کو یہ بتانا پڑا کہ حضور خود اس حالت میں کوئی اجتناب نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ نزدیک نہ پانی گندا ہوتا تھا، نہ بستر، نہ جانناز، نیز یہ بھی انھوں نے ہی بتایا کہ حائضہ یونی کے ساتھ اس کا شوہر صرف ایک فعل نہیں کر سکتا، باقی ہر قسم کا اختلاط جائز ہے۔ ان تعصبات کو حضورؐ کا اپنا فعل بتا کر حضرت عائشہؓ اور دوسری ازواج مطہرات نے نہ توڑ دیا ہوتا تو آج ہمیں اپنی گھریلو معاشرت میں جن تنگیوں سے سابقہ پیش آ سکتا تھا ان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اپنے ان محسنوں کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے ہم اب بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں کہ عیلامی کی بیوی اور ایسی باتیں بیان کرے!

دو مزید حدیثوں پر اعتراض | پھر سراگراٹ ۲۸ میں فاضل حج دوحید شیں نقل فرماتے ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ آپؐ حضرت کو دیکھا اور اس کے اکثر باشندے فقراء و مساکین تھے، اور آپؐ دوزخ کو دیکھا اور اس میں کثرت عورتوں کی تھی۔ ان احادیث کے متعلق وہ نہ صرف یہ خیال ظاہر فرماتے ہیں کہ میں اپنے آپ کو یہ یقین کرنے کے ناقابل پاتا ہوں کہ محمد رسول اللہؐ نے یہ باتیں کہی ہوں گی۔ بلکہ وہ ان احادیث کے پہلے حصے پر یہ رائے زنی بھی کرتے ہیں کہ "اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ مسلمانوں کو دولت حاصل کرنے سے منع کر دیا گیا ہے۔" اس طرح کی کوئی حدیث اگر سرسری طور پر کبھی آدمی کی نظر سے گزر جائے تو وہی غلط فہمی لاحق ہوتی ہے جس کا ذکر فاضل حج نے کیا ہے لیکن جن لوگوں نے اس حدیث کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور جن کی نگاہ سے اس نوعیت کی بیشتر احادیث گزری ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ حضورؐ نے اپنے یہ مشاہدات محض بیان واقعہ کی خاطر بیان نہیں کیے ہیں بلکہ مختلف انسانی گروہوں کی اصلاح کے لیے بیان فرماتے ہیں۔ آپؐ صرف یہی نہیں بتایا کہ غریب آدمیوں کی بہ نسبت دولت مند لوگ جہنم